اسلامی اقتدار کا نقیب

ہفت روزہ

ترجمان اسلام

لاہور

نگران اعلیٰ
مولانا مفتی محمود

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

اس شمارہ کی قیمت ۲/ روپیہ ہے

شمارہ ۱۳

۲۸ مارچ تا ۳ اپریل ۱۹۸۰ء

دارالعلوم دیوبند

صدسالہ جشن کے موقع پر

تُو عظیم اور تیرے بانی بھی یقیناً تھے عظیم
خاص ہیں تجھ پر عنایاتِ خداوندِ کریم

آبیاری تُو نے کی ہے گلشنِ اسلام کی
ہر طرف پھیلا ہوا ہے تیرا فیضانِ عمیم

خُم کے خُم تو نے لنڈھائے بادۂ عرفان کے
بالیقین ہے تیرا مے خواروں پہ احسانِ عظیم

تُو نے قائم کی جہاں میں دین و تقویٰ کی فضا
سلف کو آئی تھی تجھ سے علم و عرفاں کی نسیم

تیرے پروانوں نے آزادی کا لہرایا عَلم
تیرے فرزانوں سے گھبرایا تھا افرنگی لئیم

ہیں ترے معمارِ اوّل حضرتِ نانوتویؒ
فقر تھا جن کی ردا اور معرفت جن کی گلیم

مدّتوں شامل رہا ہے سرپرستوں میں ترے
عاشقِ سنّتؐ رشید احمدؒ سا انسانِ عظیم

تیری آغوشِ محبّت میں پلے تھے تھانویؒ
جو سراج اولیاء ہیں اور امت کے حکیم

تیری ہی مٹّی سے اٹھے تھے اسیرِ مالٹا
جنکو بخشا تھا خدائے پاک نے قلبِ سلیم

تیری نسبت پر ہمیشہ ناز فرماتے رہے
حضرت مدنیؒ امام اولیا جنّت مقیم

فیض پایا تیرے فرزندوں سے انور شاہؒ نے
جو ذکی تھا، نابغہ تھا عبقری تھا اور فہیم

تھے عبیداللہ سندھیؒ خوشہ چینوں میں ترے
سرنگوں ہے عظمتوں کے سامنے جن کی غنیم

قاری طیّب سا عظیم انساں ہے تیرا مہتمم
کوہ عزم و علم ہے جو اور اوّاہ و حلیم

تجھ کو بخشا ہے خدا نے وہ علوِ مرتبت
صالحیں تیرے دُعاگو اولیا تیرے ندیم

گونجتے ہوں زمزمے قرآن و سنت کے جہاں
کیوں وہاں سے پھر نہ ہو مایوس شیطانِ رجیم

کیوں نہ میں اکرام ان ابرار کی مدح کروں
جنکی توصیف و ثنا کرتا ہے قرآن حکیم

اکرام القادری

ہفت روزہ
ترجمانِ اسلام
لاہور

جلد نمبر ۲۲ | شمارہ نمبر ۱۴

جمعۃ المبارک ۱۶ جمادی الاول ۱۴۰۰ھ

— سرپرست —
مولانا عبیداللہ انور

— مدیر —
اکرام القادری

— مدیر معاون —
عمیر الہاشمی

بدلِ اشتراک
سالانہ
۶۵ —— روپے
ششماہی
۳۳ —— روپے
سہ ماہی —— ۱۷ روپے
قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے

خط و کتابت: ترجمانِ اسلام چوک رنگ محل لاہور

آغا سمیع پریس سے پرنٹر پبلشر مولانا عبیداللہ انور نے شیرانوالہ گیٹ لاہور ۔ ۸

متوسلین دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں

دارالعلوم دیوبند کا جشن صد سالہ موجودہ دور کی بہت بڑی اور اہم ضرورت تھی جس کا بیڑا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے پیرانہ سالی کے باوجود کاندھوں پر اٹھایا اور دارالعلوم کے کارپردازوں اور متوسلین کے تعاون سے اس عظیم پروگرام اور منصوبے کی تکمیل کردی۔

دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ میں دُنیا کے کونے کونے سے ہزاروں علماء اور لاکھوں عوام نے شرکت کی اور علم و عرفان سے اپنی جھولیاں بھریں۔ آنے والوں نے اپنے اکابر کے لگائے ہوئے سدا بہار پودے کو ایک تناور درخت کی صورت میں دیکھ کر آنکھیں روشن اور دل ٹھنڈا کیا۔ فضلاء دارالعلوم نے ایمان افروز اور روح پرور خیالات و مقالات سُننے اور عالمی سطح پر دین اسلام کی منظم و مربوط نشرواشاعت کے منصوبوں پر بھرپور توجہ دی۔ ہم پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ جشن میں شرکت کرنے والے دارالعلوم کے متوالوں نے اپنی دینی، ملی، قومی اور تبلیغی ذمہ داریوں کو بدرجۂ اتم محسوس کیا ہوگا اور سوچا ہوگا کہ ان کی مساعی میں کہاں کہاں جھول اور رخنے ہیں اور انہیں کیسے دُور کیا جاسکتا ہے۔ متوسلین دارالعلوم نے یہ طے کیا ہوگا کہ تلافی مافات کی کون کون سی صورتیں ممکن ہیں اور اس سلسلے میں کیا کیا تدابیر عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔

یہ بات من وجہ البصیرت کہی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن کوئی روایتی قسم کا جشن نہیں کہ تین دن تک مکمل دینی فضا قائم کردی جائے اور اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ جشن دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ یہ صرف دیوبند کی ہی ضرورت نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی غلط نہ ہوگا کہ محض جشن برائے جشن کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بزرگانِ دیوبند کسی دن کو بطور یادگار منانے کی روش پر کبھی گامزن نہیں رہے نا ہی اسلام میں کوئی اس قسم کی ہدایت ہے۔ موجودہ جشن کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ کسی دن کی یاد کے طور پر اتنا بڑا اہتمام کیا گیا ہو، بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عالمِ اسلام کو موجودہ دَور میں جس قسم کے مسائل اور حالات کا سامنا ہے، قرآن و سنّت کی روشنی میں اُن کا حل تلاش کیا جائے اور امّتِ مسلمہ کے اجتماعی مفادات کے لئے اجتماعی طور پر سوچا جائے۔

ہم شرحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان مقاصدِ جلیلہ کی تکمیل کے لئے ہمیں قرآن و سنّت کی اسی شاہراہِ اعظم پر چلنا ہوگا جس پر چل کر ہمارے عظیم اکابر کامیاب و سرخرو ہوئے۔ ہمیں اپنی خواہشات، اپنے مفادات، معمولی رنجشوں اور ضرورتوں کو پسِ پشت ڈالنا ہوگا اور دینی و قومی تقاضوں کو اوّلیت دینی ہوگی۔ ان صداقتوں پر اگر وابستگانِ دیوبند خلوصِ دل سے کاربند اور عمل پیرا ہوجائیں تو باطل قوتیں پاش پاش ہوسکتی ہیں۔ فرصت کے اوقات نکال کر ہمیں اپنے اکابر کی تابناک تاریخ اور فقید المثال قربانیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے اکابر نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا کیسے مقابلہ کیا۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ ہمیں آج پھر انہی فتنوں کا سامنا ہے جن کی سرکوبی ہمارے اسلاف نے اپنا تن، من، دھن قربان کرکے کی تھی۔ ان فتنوں نے نئے پر پرزے نکالے ہوئے ہیں اور اپنے لئے اچھے سے نام تجویز کرلئے ہیں۔

ان حالات میں ہماری ذمّہ داریاں کیا ہیں۔ کیا یہی کہ ہم اپنے اکابر کا نام اپنی مسجدوں میں لیتے رہیں اور اس پر فخر کرتے رہیں۔ آج ہم صرف یہی کچھ کر رہے ہیں، مگر اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اسطرح سے وقتی طور پر ہم اپنے ضمیر کو مطمئن کرسکتے ہیں اور عوام کو نعرے بازی کی راہ پر لگا سکتے ہیں۔ اسوۂ اکابر کی پیروی نہیں کرسکتے۔ ہمارے اکابر کا دائرۂ کار صرف مساجد کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ ہر میدان کے مرد تھے۔ خدمتِ دین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان کی نظر سے اوجھل رہا ہو اور جس میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام نہ دیے ہوں۔ ہمارے اسلاف نے اپنی بے کراں اور ہمہ جہت شخصیتوں کے بل پر ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ تسبیح و تہلیل، تدریس و تبلیغ، تصنیف و تالیف، وعظ و تذکیر سے لے کر ہنگامہ ہائے دار و رسن تک کونسا ایسا مرحلہ ہے جو ان نفوسِ قدسیہ نے طے نہ کیا ہو اور اپنا لوہا نہ منوایا ہو۔

لیکن ایک ہم ہیں کہ ہم نے تمام اطراف و جوانب سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور صرف "پدرم سلطان بود" کے سہارے پر زندہ رہنے ہی کو مقصدِ زندگی اور میدانِ عمل قرار دے لیا ہے۔

میری معروضات کا یہ مطلب بھی نہیں کہ معاملہ بالکل چوپٹ ہوگیا اور کسی گوشے میں بھی کسی درجہ کی کوشش نہیں ہو رہی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کچھ تھوڑا بہت کام ضرور ہو رہا ہے مگر اس پیمانے اور اس ولولے سے نہیں جیسا حالات ہم سے تقاضا کرتے ہیں اور اکابرِ دیوبند کی نسبت سے جو ہمارا فرضِ منصبی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ دیوبند کے جشنِ صد سالہ کے بعد ہمارے طریقۂ کار اور طرزِ عمل میں واضح اور نمایاں تبدیلیاں آئیں گی اور ہم اپنی صفوں کو ایک مرتبہ پھر منظم و مربوط کرکے ہر نوع کی باطل قوتوں پر یلغار کریں گے اور اپنے مثبت عمل سے اپنے اسلاف کا نام روشن کرنے کی تگ و دو میں اپنی جانوں کو کھپا دیں گے۔

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ کیا
دو اشک ہی بہت ہیں گر کچھ اثر کریں

مرتبہ : وجاہت انجم

دارالعلوم دیوبند

کھلی اور چھپی کہانی — ایک صدی کی زبانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسلامیان برصغیر اپنی عظمت رفتہ پر اپنے آپ سے اظہار تعزیت کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ جو کل ہندوستان کی اٹھارہ لاکھ مربع میل زمین پر اپنے گھوڑوں کی ٹاپ سنا کرتے تھے، آج برطانوی پرچم کو لہراتا دیکھ کر کچھ نہ کر پاتے تھے۔ خیرات بانٹنے والے ہاتھ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگ رہے تھے۔ لگتا تھا مسلمان کا جذبۂ حریت ایک مدت تک بیدار نہ ہو سکے گا مگر ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں انگریز سے نبرد آزما ہونے والے بعض مردانِ حق کی ہمتوں کے چراغ ابھی گل نہ ہونے پائے تھے۔ انہوں نے فرنگی پر اسی رخ سے ضرب کاری لگانے کا فیصلہ کیا جس رخ سے وہ خود مسلمان قوم پر وار کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دیوبند کی مسجد چھتہ کے قریب ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، جو برصغیر میں دینی علوم اور اخلاق و کردار کے علاوہ لافانی جذبۂ حریت کی ایک عظیم درسگاہ بن گیا۔

فیضانِ دیوبند:

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے تقریباً سو میل دور ایک چھوٹے سے قصبہ دیوبند کی سرزمین ایک عرصہ سے دین کے مشائخ اور اکابر کا مسکن رہی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس قصبہ میں واقع ویران مگر تاریخی مسجد چھتہ میں بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے بھی چلہ کشی کی تھی دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت حاجی عابد حسین کا قیام بھی اسی مسجد میں تھا۔ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں معروف اہل علم ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس بستی کا ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ بکرماجیت کے عہد میں بھی دیوبند کا نام آیا ہے۔ طوفان نوح کے متصل دور میں بھی اس بستی کا نشان ملتا ہے۔ سنسکرت کے اہل قلم نے کورو پانڈو کے عہد میں بھی دیوبند کا ذکر کیا ہے۔ دیوبند مغل شہنشاہوں کے راستے کی ایک منزل اور اکثر عارضی قیام کا کیمپ رہا ہے۔ اگر موجودہ آبادی سے دو میل مشرق کی جانب دیکھیں تو یہاں کئی پختہ عمارتوں کے اکثر نشان ملیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ ہزاروں سال پہلے دیوبند کی اصل آبادی یہ رہی ہے۔ شہر میں ایک بلند عمارت ہے جس میں اب سرکاری دفاتر ہیں۔ آئین اکبری میں اسے ایک قلعہ بتایا گیا ہے، مگر اب اس قلعہ کا کوئی نشان موجود نہیں۔ اس قلعہ کے ایک کنوئیں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس میں حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں دیو قید کئے گئے تھے۔

مسجد چھتہ میں ایک انار کے درخت کے نیچے جدوجہد کے اس سرچشمے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس عظیم الشان منصوبے کو عملاً "محمودین" یعنی دو افراد نے جن کا نام محمود تھا، شروع کیا۔ ایک استاد ایک شاگرد، استاد حضرت ملا محمود دیوبندی، جنہیں مدرس کی حیثیت سے میرٹھ سے منگوایا گیا اور شاگرد دیوبند کے ایک نوجوان محمود حسن تھے، جو بعد میں شیخ الہندؒ کے نام سے معروف ہوئے اور جنہوں نے تحریک ریشمی رومال کے ذریعے فرنگی حکومت کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔ اس مختصر قافلہ کے سالار مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔

نگہبانِ دیوبند:

"قاری محمد طیب قاسمی دیوبند کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہندوستان کے چند اہل اللہ اور ارباب قلوب نے ایک مجلس میں اپنے اپنے دل پر گزرنے والی واردات کا ذکر کیا۔ کسی نے کہا مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ ان حالات میں جو مسلمانوں کو درپیش ہیں ایک دینی مدرسہ کا قیام ہماری ایک ناگزیر ضرورت ہے جو کم از کم مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھ سکے دوسرے نے کہا میرے قلب پر بھی یہی وارد ہوا ہے۔ تیسرا بولا مجھے خواب میں یہی حقیقت دکھائی گئی ہے۔ اس طرح قدرتی طور پر ایک باطنی اجتماع میں اس دینی مدرسہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا اجراء عام طریقے پر ہرگز نہیں ہوا کہ چند افراد نے بیٹھ کر مشورہ کیا ہو کہ ایک مدرسہ یا ادارہ قائم کیا جائے اور اتفاق رائے سے مدرسہ قائم کر دیا گیا ہو۔

جب مدرسہ کے طلباء کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا تو حضرت نانوتویؒ نے اس مدرسہ کے لئے بلکہ اس طرز کے دوسرے مدارس کے لئے آٹھ اصول وضع فرمائے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

" اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاءاللہ تعالیٰ

بشرطِ توجہ الی اللہ چلے گا، اور کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی بھی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم تنازع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے البتہ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے دستورِ اساسی کی یہ شق نمبر ۷ ہے۔ اس کے مندرجات میں جو استغنا توکل علی اللہ، رجوع الی اللہ، بے نیازی، عزتِ نفس اور وقار پایا جاتا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی استغنا کا نتیجہ ہے کہ علمائے دیوبند مزاجاً حکام کی دہلیز پر جھکنے سے مجتنب رہے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ جب تحریکِ خلافت کے موقع پر دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم پہنچے تو یہ اساسی اصول حضرت نانوتویؒ کے قلم سے لکھے ہوئے ان کے سامنے پیش کئے گئے (یہ اصول آج بھی دارالعلوم میں بعینہٖ اس کے بانی کے قلم سے لکھے ہوئے موجود ہیں) تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، فرمانے لگے:

"ان اصولوں کا عقل سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو خزانۂ غیب اور مخزنِ معرفت سے نکلے ہوئے ہیں۔ حیرت ہے کہ جن نتائج تک ہم سو برس میں دھکے کھا کر پہنچے ہیں، یہ بزرگ سو برس پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے۔

مدرسے کے اجراء کے بعد یہ مدرسہ مختلف مساجد اور پھر کرایہ کے مکانات میں چلتا رہا۔ سات آٹھ برس کے بعد جب طلباء کی کثرت ہوئی اور رجوعِ عام ہوا تو اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ مدرسے کا اپنا کوئی مستقل مکان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ یہ جگہ اور اس کے حصے جہاں آج دارالعلوم کی وسیع عمارات کھڑی ہیں، تحریک و ترغیب کے بعد مدرسے کے لئے دیے جانے لگے۔ بعض افراد نے قیمتاً دیے، بعض نے محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر اس طرح ایک بڑا قطعہ مدرسہ کے حصہ میں آگیا۔ یہ جگہ عموماً شہر کا میلا بھرنے اور کوڑیوں کی جگہ تھی روایت ہے کہ دارالعلوم کے قیام سے تقریباً ایک صدی پہلے یہاں سے سید احمد شہید بریلوی معہ اپنے رفقاء مجاہدین کے گزرے تو فرمایا مجھے یہاں سے علم کی بُو آتی ہے۔

٭

زمین مل جانے کے بعد مولانا رفیع الدین دیوبندی کے زمانۂ اہتمام میں عمارتِ مدرسہ تجویز ہوئی اور اس کی پہلی بنیاد کھود کر تیار کی گئی جب اس عمارت کو اٹھانے کے لئے بھرنے کا وقت آیا تو مولانا رفیع الدین نے خواب دیکھا کہ اس زمین پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں عصا ہاتھ میں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مولانا سے فرمایا: "شمال کی جانب جو بنیاد کھودی گئی ہے اس سے صحنِ مدرسہ تنگ اور چھوٹا رہے گا۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عصائے مبارک سے دس بیس گز شمال کی جانب ہٹ کر نشان لگایا کہ بنیادیں یہاں ہونی چاہیئے تاکہ مدرسہ کا صحن وسیع رہے (اب صحن کی لمبائی اسی جگہ تک ہے) مولاناؒ خواب سے بیدار ہو کر علی الصبح بنیادوں کے معائنہ کے لئے گئے تو حضور نبی اکرم علیہ السلام کا لگایا ہوا نشان بدستور اسی طرح موجود تھا۔ انہوں نے پھر کسی سے مشورہ کئے بغیر اسی نشان پر بنیاد کھدوائی اور مدرسے کی تعمیر شروع ہو گئی۔

٭

ایک دن حضرت مولانا رفیع الدین دارالعلوم کے صحن میں کھڑے تھے۔ چند طلبہ بھی حاضر تھے کہ دورۂ حدیث کا ایک طالبِ علم مطبخ سے کھانا لے کر آپ کے سامنے آیا۔ اس وقت مطبخ میں صرف چودہ یا پندرہ طلبہ کا کھانا پکتا تھا۔ اس نے نہایت گستاخانہ انداز میں شوربے کا پیالہ مولانا کے سامنے زمین پر دے مارا اور کہا "یہ ہے آپ کا اہتمام و انتظام؟ کہ اس شوربے میں مصالحہ ہے نہ گھی۔ پانی جیسا شوربہ ہے"۔ کچھ اور بھی سخت سست الفاظ کہے۔ اس گستاخی پر طلباء برہم ہوگئے مگر چونکہ مولانا پوری متانت کے ساتھ خاموش تھے اس لئے طلبہ بھی خاموش رہے۔ بجائے کچھ فرمانے کے مولانا نے اس گستاخ طالبعلم پر تین مرتبہ اس کے سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی جب وہ واہی تباہی بکنے کے بعد چلا گیا تو مولانا نے حیرت سے دوسرے طلبہ سے کہا: "کیا یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم ہے؟" طلبہ نے اثبات میں جواب دیا۔ مولانا نے کہا: "یہ اس مدرسہ کا طالب علم نہیں ہے۔" طلبہ نے کہا "مطبخ کے رجسٹر میں اسکا نام باقاعدہ درج ہے اور یہ برابر مدرسہ سے کھانا لے رہا ہے" فرمایا: کچھ بھی ہو یہ اس مدرسہ کا طالب علم نہیں ہے۔ چند دن بعد چھان بین ہوئی تو ثابت ہوا کہ وہ مدرسے کا طالب علم نہیں ہے۔ اس کا ایک ہم نام دوسرا طالب علم ہے۔ اس نے دھوکے سے کھانا لینا شروع کر دیا تھا۔ طلبہ کے اصرار پر مولانا رفیع الدین نے وہ تفصیل بتائی جس کی بنیاد پر انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ اس لڑکے کے مدرسہ کے طالب علم ہونے کی نفی کی تھی۔ انہوں نے کہا:

"میں ابتدا میں مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے گریزاں تھا، مگر جب بھی سبکدوش ہونے کا ارادہ کرتا تو مولانا محمد قاسم نانوتوی روک دیتے تھے۔ مجبوراً میں پھر اپنے فرض کی ادائیگی میں لگ جاتا۔ اسی ردّ و انکار اور جبر و اصرار کے چند روز بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ احاطہ مولسری دارالعلوم کا کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس کی من پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ لینے والے آ رہے ہیں اور دودھ لے کر جا رہے ہیں۔ کوئی گھڑا لے کر آتا ہے، کسی کے ہاتھ میں لوٹا ہے کسی کے پاس پیالہ، کسی کے پاس برتن نہیں ہے تو وہ چلّو میں دودھ لئے جا رہا ہے۔ ہزاروں تشنگانِ شوق بارگاہِ حضور (علیہ السلام) سے دودھ لے جا رہے ہیں۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد میں مراقب ہوا کہ اس واقعہ کا کیا مطلب ہے؟ تو پھر منکشف ہوا کہ کنواں مثل دارالعلوم ہے اور

دودھ مثل علم اور قاسم العلوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دودھ پینے والے طالب علم ہیں جو حسب ظرف اپنی تشنگی کا سامان کر رہے ہیں۔ مدرسہ دیوبند میں جب داخلہ ہوتا ہے اور طلبہ آتے ہیں تو میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا اور یہ بھی، مگر اس گستاخ طالب علم پر میں نے سر سے پاؤں تک تین مرتبہ نگاہ ڈالی یہ اس مجمع میں تھا ہی نہیں۔

حضرت مولانا رفیع الدین رح مہتمم ثانی دارالعلوم کا یہ قول بزرگوں سے سننے میں آیا ہے کہ مدرسہ دیوبند کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتوی کرتے ہیں، جو ان کے قلب پر وارد ہوتا ہے وہ میرے قلب پر منعکس ہو جاتا ہے اور میں وہی کام کر گزرتا ہوں۔ چنانچہ جب مولانا کوئی غیر معمولی کام کرتے تو اگلے دن حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کچھ عرصہ سے یہی کام جو آپ نے انجام دیا ہے میرے دل میں آ رہا تھا کہ ایسا ہونا چاہیئے جیسے آپ نے عملاً انجام دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ حضرت مولانا رفیع الدین رح جہاں قوی النسبت اکابر میں سے تھے وہیں لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ امورِ متعلقہ مولانا کے ارشاد، احکام اہتمام قلمبند ہوتے تو مولانا اس پر اپنی مہر لگا دیتے تھے۔

ثنا خوانِ دیوبند

دارالعلوم جس دور میں قائم ہوا اس وقت برطانوی حکومت مسلمانوں سے سخت بدظن تھی۔ ان کے ہر قول و فعل کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے دارالعلوم کی نسبت ایک عرصہ سے خفیہ و علانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی نے ایک معتمد خاص جان پامر کو اسی غرض سے دارالعلوم بھیجا کہ وہ تحقیقات کر کے رپورٹ دے کہ اس مدرسے کے قیام کا مقصد کیا ہے اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں۔ جان پامر نے دارالعلوم کے "معائنہ" کے بعد جو رپورٹ مرتب کی اور جو تاثرات اخذ کئے وہ اس نے اپنے ایک دوست کے نام خط میں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جان پامر نے اس خط کی نقل دارالعلوم کو بھی بھیجی تھی، جو وہاں کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

جان پامر لکھتا ہے:

"دارالعلوم پہنچ کر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا جس میں چٹائی کے فرش پر چھوٹے چھوٹے لڑکے کئی درجن کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک بڑا لڑکا ان کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے لڑکوں سے دریافت کیا تمہارا استاد کون ہے؟ ایک لڑکے نے اشارہ سے بتایا تو معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا تھا وہی استاد ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا استاد ہو گا۔ میں نے پوچھا: آپکے لڑکے کیا پڑھتے ہیں؟ جواب دیا: یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں سے آگے بڑھا تو ایک صاحب میانہ قد نہایت خوبصورت چہرہ ایک جگہ بیٹھے تھے۔ سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی۔ قریب پہنچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر یہ لوگ چونکیں گے مگر کسی نے مطلقاً توجہ نہیں دی۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی نہیں سنے تھے۔ یہاں سے اٹھ کر میں دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے تقریر کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیدس کی روح ان میں آ گئی ہے۔ اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و مقابلہ کا ڈھنڈر سے مساوات درجہ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلباء سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آ گیا۔ بعض طلبہ نے سوالات کے صحیح جواب دیکر مجھے دوطرہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہاں سے اٹھ کر میں تیسرے دالان میں گیا ایک مولوی صاحب کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے یہاں سے میں ایک زینہ پر چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا۔ اس کے تین طرف ملحقہ مکان تھے جس میں ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ وہاں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے۔ میں یہ سننے کے لئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں دبے پاؤں انکے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے سے کہا "بھائی! کل کے سبق میں شکل عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر تم سمجھتے ہو تو بتلاؤ۔" دوسرے اندھے نے دعویٰ بیان کیا اور اسکی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت فراہم کر دیا۔ پھر آپس میں جو انکی بحث شروع ہوئی تو میں دنگ رہ گیا، اور مسٹر بریگر پرنسپل کی تقریر کا سماں میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں گیا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے حرف و نحو کی کتابیں نہایت ادب سے استاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ تیسرے درجے میں علم منقول کا درس ہو رہا تھا۔ میں دوسرے زینے سے اتر کر نیچے آیا۔ میرا خیال تھا کہ مدرسہ بس اسی قدر ہے۔ اتفاقاً ایک شخص سے ملاقات ہوئی میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی۔ اس نے کہا "نہیں قرآن شریف دوسری جگہ پڑھایا جاتا ہے۔" میں نے پوچھا کہاں؟" وہ مجھے مسجد میں لے گیا۔ مسجد کے دالان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ایک نابینا حافظ کے سامنے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ حافظ نے ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑ کر سختی سے جھڑک دیا۔ بچہ چلایا۔ میں نے اپنے رہنما سے کہا "ننھے منے بچوں سے ایسی سخت محنت لینا بڑا ظلم ہے۔" اس نے ہنس کر جواب دیا: یہ ظلم نہیں ہے شفقت ہے۔ بچوں کو شروع ہی سے محنت شاقہ کا عادی بنا دینا عین حکمت اور ان کی آئندہ زندگی میں پیش آنیوالی مشکلات پر قابو پانے کیلئے بہت ضروری ہے آجکل مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لئے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے۔"

میں نے پوچھا "پچھلے سال اخباروں میں دیکھا تھا کہ چار طالبعلموں کے دستار فضیلت باندھی گئی۔ ان میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟" وہ بولا "ہاں ایک صاحب ہیں چلیئے میں ملا دیتا ہوں" وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں ایک نوجوان شخص بیٹھا تھا۔ ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھی تھی اور دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف دو بندوقیں پڑی تھیں۔ میں نے سلام کیا۔

اس نے کمال شفقت سے جواب دیا۔ میں نے پوچھا "سالِ گذشتہ آپ ہی کے دستار فضیلت بندھی ہے؟" بولے "اساتذہ کی عنایت ہے۔" میں نے کہا: "یہ کونسی کتاب ہے؟" کہنے لگے "یہ عربی میں ایک فنی کتاب ہے، ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لئے بھیجی ہے۔ اسکی اجرت ایک ہزار روپے مقرر ہوئی ہے۔ مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہو گئے ہیں اور تین چوتھائی کے قریب کام مکمل ہو گیا ہے، بقیہ انشاء اللہ ایک مہینہ میں ہو جائے گا۔" میں نے پوچھا "یہ بندوق کیسی ہیں؟" کہنے لگے "مجھے شکار کا شوق ہے، سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں۔ گیارہ سے ایک بجے تک شکار کھیلتا ہوں اور دو بجے سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں۔" میں نے دریافت کیا "آپ ملازمت کیوں نہیں کر لیتے۔" وہ بولے "خدا تعالیٰ نے گھر بیٹھے ڈھائی سو روپے مہینہ دیتا ہے پھر کس لیے نوکری کروں" (یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے) یہاں سے اٹھ کر کتاب خانہ میں آیا۔ مہتمم نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے کتابوں کی فہرست دکھائی۔ میں حیران رہ گیا کہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس کی کتاب موجود نہ ہو۔ پھر ایک دوسرا رجسٹر دکھایا جو طلباء کی حاضری کا تھا، نہایت صاف اور خوش خط لکھا ہوا تھا۔ کل ۲۱۰ طلبہ میں سے ۲۰۸ حاضر تھے۔ مہتمم نے مجھے تین بڑے بڑے رجسٹر دکھائے اور بتایا یہ سال بھر کے آمد و صرف کا حساب ہے۔ میں نے دیکھا تو تاریخ وار نہایت محنت سے حساب لکھا ہوا تھا۔ گوشوارے سے معلوم ہوا کہ گذشتہ سال کے آخر میں خرچ کے بعد کچھ روپیہ بچ گیا تھا۔ طبیعت چاہتی تھی کہ کتابوں کی کچھ سیر کروں مگر وقت تنگ ہو گیا تھا اور شام ہو رہی تھی، مجبوراً واپس ہوا۔ میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں۔ کوئی ضروری فن ایسا نہیں جو یہاں نہ پڑھایا جاتا ہو۔ جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو پروفیسر ہزاروں روپے لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کر رہا ہے۔ مسلمانوں کیلئے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم بھی یہاں تعلیم پائے تو خالی از نفع نہیں۔ انگلستان میں اندھوں کا سکول سنا تھا مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف و دست سے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔ مجھے افسوس ہے آج سر ولیم میور (سابق گورنر صوبہ متحدہ) موجود نہیں ہیں ورنہ وہ کمال ذوق و شوق اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔"

تشنگانِ دیوبند

مولانا سید نور الحسن بخاری لکھتے ہیں "غالباً ۱۹۴۰ء میں مجھے حضرت امیر شریعتؒ سے شرف نیاز حاصل ہوا اور اس کے دو تین سال بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے۔ ان اکابر کی صحبت سے مجھے تحصیل علم دین کا شوق دامنگیر ہوا اور میں غالباً ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے رخصت لے کر حصول علم کیلئے دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ میں سکولوں کے ماحول سے نکل کر گیا تھا جہاں دس بجے رات کے بعد پڑھنا صحت کے لئے مضر سمجھا جاتا ہے۔ میں نے جب دارالعلوم کے اندر پہلی رات اٹھ کر جا بجا دیکھا کہ طلبہ حضرات بارہ ایک بجے رات کو کتابوں پر جھکے پڑے ہیں، تو مجھے ان کی یہ عادت اچھی نہ لگی مگر یہ دارالعلوم کا معمول تھا پھر لطف یہ کہ کوئی ذمہ کام نہیں۔ کوئی استاد کہنے پوچھنے والا نہیں، مگر طلبہ ہیں کہ آدھی رات کے بعد تک بھی پڑھتے ہیں۔ سارا دن پڑھائی، رات کا بیشتر حصہ پڑھائی۔ رات کو نیند نہ دن کو آرام۔ خوراک کا یہ حال کہ دو چپاتیاں اور عموماً دال۔ کبھی کبھار بڑا گوشت جس میں گھی برائے نام۔ میں سوچتا تھا اسطرح ان کی صحت جواب دے جائیگی مگر اس ماحول میں رہتے ہوئے میرا اپنا یہ حال ہو گیا کہ خود بھی اسی رنگ میں رنگا گیا۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے۔ کراچی سے سلہٹ اور پشاور سے مدراس تک انکی دینی اور سیاسی سرگرمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ عموماً ایسا ہوتا کہ رات کو گیارہ بجے آپ دور دراز کے طویل سفر سے واپس دارالعلوم تشریف لائے۔ دارالعلوم پہنچتے ہی دارالحدیث پہنچ جاتے۔ نہ کوئی الارم نہ کوئی گھڑیال، مگر جانے کس طرح پورے دارالاقامہ میں خبر ہو جاتی اور طلبا تھے کہ کمروں اور بستروں سے نکل کر بھاگے بھاگے دارالحدیث پہنچ کر سبق میں شریک ہو جاتے۔ اگر کسی طالب علم کو نیند کے غلبہ سے اونگھ آ جاتی تو حضرت مدنیؒ فرماتے جاؤ آنکھیں دھو آؤ، مگر یہ نہ ہوتا کہ طالب علم محو خواب ہوں اور بخاری شریف کے درس سے محروم رہ جائیں۔ ہر طالب علم دوڑ کر دارالحدیث پہنچتا اور آناً فاناً دارالحدیث طلبہ سے بھر جاتا تھا۔

امتحان کے دنوں میں طلبہ کا ذوق شوق اور بھی دوچند ہو جاتا۔ سالانہ امتحان کے دنوں میرا یہ حال تھا کہ دو راتیں مسلسل اپنے رفقا کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ایک دوسرے کی نوٹ بکیں دیکھتے رہے۔ اگلی صبح صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا امتحان تھا۔ رات بھر جاگتے تیاری کرتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح کی اذان ہو گئی۔ صبح نماز دارالعلوم کی مسجد میں باجماعت ادا کی۔ میرے حواس تو بفضل تعالیٰ بجا رہے مگر میرے ساتھی کا یہ حال تھا کہ ان پر نماز کے دوران ہی نیند کا اسقدر غلبہ ہوا کہ وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ امام کے ساتھ سجدہ اور رکوع نہ کر سکے۔

مجھے وہ منظر آج بھی یاد ہے کہ رات کو غالباً نماز عشاء سے قبل چہل قدمی کیلئے دارالعلوم سے باہر نکل گیا۔ شہر کے کنارے ایک پلی پر ایک طالب علم بیٹھے چنے چبا رہے تھے۔ دریافت کیا تو پتہ چلا کہ مدرسہ سے کھانا نہیں ملتا۔ انہوں نے وجہ بتائی تھی جو مجھے یاد نہیں رہی اور گرہ سے کھانا کھانے کی استطاعت نہیں۔ میں دارالعلوم کے اس عظیم فرزند کے کردار سے از حد متاثر ہوا۔ یہ مولانا خوشی محمد تھے غالباً جالندھر کے رہنے والے۔

بانیانِ دیوبند

ایک زمانہ تھا کہ دیوبند اور اس کے نواح میں (ہندو روایت کے زیر اثر) نکاح بیوگان کو انتہا درجے کا عیب سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی بیوہ کے نکاح کا نام لیتا تو تلواریں نکل آئیں۔ دردمند مسلمانوں نے نکاح بیوگان کی ایک تحریک شروع کر دی۔ ایک بزرگ اس تحریک کے لئے سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ پہلے پہل انہوں نے اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہمخیال بنایا۔ اس کے بعد دیوبند میں ایک جلسہ عام کیا۔ اس بزرگ نے اس بہت بڑے جلسہ میں خطاب کیا۔ خطاب کے درمیان مجمع میں سے ایک شخص

اٹھا کر کچھ عرض کرتا ہے۔ یہ بزرگ اپنی خداداد ذہانت سے پہلے ہی سمجھ گئے کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جواب میں کہنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آتا ہوں ایک فوری ضرورت پیش آگئی ہے۔ یہ بزرگ اپنے گھر گئے۔ بڑی بہن بیوہ تھیں۔ ۹۵ برس کی عمر میں۔ نکاح کے قابل ہی نہ تھیں۔ اس بزرگ نے اپنی بڑی بہن کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھبرا کر کہنے لگیں: بھائی! تم ایک عالم دین ہو، یہ کیا کر رہے ہو۔" فرمایا: "میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔" کہنے لگیں "سنت رسول کا احیاء مجھ ناکارہ پر منحصر ہے؟" فرمایا: آپ نکاح کر لیجئے۔" بہن بولیں: میری حالت تم دیکھ رہے ہو۔ کمر جھک گئی، منہ میں دانت نہیں ..." کہا: "میں سب جانتا ہوں، اعتراض کرنے والوں کو اس سے سروکار نہیں۔" عظیم بہن نے کہا: "اگر سنت رسول میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو اس کے لئے تو میں جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں۔" ان کے دیور کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دیور سے اپنی بہن کا خاندان کے چودہ پندرہ افراد کی موجودگی میں نکاح پڑھا دیا۔ گواہ بنا دیے گئے۔ اس کام میں کچھ دیر لگ گئی۔

وہ بزرگ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کر دی۔ وہی سائل کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے۔ اس طرح ہم پر کیا اثر ہوگا؟" کہنے لگے: کون کہتا ہے۔ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ اسی موقع پر دو، تین آدمی کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرۃ اور رسومات بد کے خاتمہ کی تحریک چلانے والے جنہوں نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔

اس مجلس میں ہی آپ کی اس قربانی کے نتیجے میں ستر۔ اسی کے قریب نکاح پڑھائے گئے اور بعد میں اس سنت پر اس انداز میں عمل ہوا کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہوا۔

٭

حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں، لیکن انہوں نے تین اہم اور بنیادی کارنامے انجام دیے ہیں۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت خلافت اسلامیہ کی تائید میں منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خلیفہ تھے۔ اگرچہ خلافت نام کی ہی رہ گئی تھی، مگر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لئے انہوں نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے، اور تیسرا بڑا کام نکاح بیوگان کی عظیم الشان اصلاحی تحریک تھا۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسل اور اولاد میں سے تھے۔ ۱۸۳۲ء کو قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام خورشید حسن تھا۔ آپ کے والد بزرگوار ایک زمیندار تھے جو تعلیم سے چنداں بہرہ ور نہ تھے۔ البتہ بزرگوں کی نیک صحبت سے ضرور متاثر تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

"ایام طالب علمی میں مولوی محمد قاسم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہیں اور ان میں سے جاری ہو کر ہزاروں نہریں چاروں طرف بہہ نکلی ہیں۔ انہوں نے میرے والد محترم حضرت مولانا مملوک علی سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا "تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا۔" ارواح ثلاثہ میں مولانا نانوتوی کے ایک اور خواب کا ذکر خود ان کے الفاظ میں اس طرح ہے: میں خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی چیز پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور اس طرف سے ایک نہر آتی ہے جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے: یہ خواب انہوں نے مولوی محمد یعقوبؒ برادر شاہ اسحٰق سے اس طرح بیان کیا کہ حضرت! ایک شخص نے اس طرح کا خواب دیکھا ہے۔ انہوں نے یہ تعبیر بتائی کہ اس شخص سے دین کو بہت تقویت ملے گی اور اس کی خوب شہرت ہوگی؛ لیکن شہرت کے بعد جلد ہی اسکا انتقال ہو جائے گا۔

٭

مولانا نانوتویؒ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق و محبت اور اخلاص و عقیدت تھی۔ وہ آنحضرت علیہ السلام کی سنت کے شیدائی تھے۔ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ سے کئی میل دور ہی سے پابرہنہ ہو کر چلتے گئے۔ دل نے اجازت نہ دی کہ دیار حبیب علیہ السلام میں جوتا پہن کر چلیں، حالانکہ وہاں سخت نوکدار پتھر اور سنگریزے بہت ہوتے ہیں۔ مولانا کے ہم عصر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ مولانا نانوتوی اس طرح برہنہ پا میلوں کی مسافت طے کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ہندوستان میں اکثر حضرات سبز رنگ کا ایک جوتا کیمخت پہنتے تھے جو اب بھی پہنتے ہیں، لیکن حضرت نانوتویؒ نے یہ جوتا پوری عمر میں ایک مرتبہ بھی نہیں پہنا۔ اگر کبھی کسی نے یہ جوتا تحفہ میں دیا تو کسی اور کو ہدیہ دے دیتے۔ سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لئے گریز کرتے کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ گنبد کا رنگ سبز ہے۔

٭

اکابر دیوبند میں سے ایک ایک سلف صالحین کا نمونہ تھا، اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ مولانا محمد انوریؒ، علامہ سید محمد انور شاہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مقدمۂ بہاولپور کے موقع پر جب حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے کفر پر بے نظیر تقریر کی اور اس میں یہ بھی کہا: "جو چیز دین میں تواتر سے ثابت ہو اُسکا منکر کافر ہے۔" قادیانیوں کے گواہ نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: "آپ کو چاہیئے کہ امام رازیؒ پر کفر کا فتوی دیں، کیونکہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں علامہ بحر العلوم نے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔" اس وقت بڑے بڑے علماء وہاں موجود تھے۔ سب پریشان ہوئے کہ فواتح الرحموت اس وقت پاس نہیں ہے۔ اس اعتراض کا جواب کس طرح دیا جائے؟ مولانا محمد انوریؒ جو اس موقع پر موجود تھے کہتے ہیں ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب نہ تھی۔ مولانا عبداللطیف ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا مرتضیٰ حسن حیران تھے کہ کیا جواب دیں۔ مگر حضرت شاہ صاحب کی آواز کمرۂ عدالت میں گونجی "جج صاحب لکھئے، میں نے ۳۲ سال ہوئے یہ کتاب دیکھی تھی اب ہمارے پاس یہ نہیں ہے۔ امام رازی دراصل یہ فرماتے ہیں کہ حدیث

"لا تجتمع امتی علی الضلالة" تواترِ معنوی کے رتبے کو نہیں پہنچتی، لہٰذا انہوں نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے نہ کہ تواترِ معنوی کے حجت ہونے کا۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکہ سے کام لیا ہے۔ ان سے کہو کہ عبارت پڑھیں، ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں۔ قادیانی گواہ نے عبارت پڑھی۔ واقعی اس کا مفہوم وہی تھا جو حضرت شاہ صاحب نے بیان کیا۔ کمرہ عدالت میں حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا اور حضرت شاہ صاحب نے کہا: جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں، میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے کچھ کتابیں دیکھ رکھی ہیں۔ میں انشاء اللہ مفحم ہونے کا نہیں ہوں۔"

٭

مولانا سید اصغر حسین دیوبند میں حضرت میاں صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ علوم قرآن و سنت کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم و فنون کے کامل محقق۔ ایک مرتبہ مفتی محمد شفیعؒ ان کے گھر گئے تو انہوں نے آموں سے تواضع کی۔ جب آم چوس کر فارغ ہو گئے تو مفتی محمد شفیع مرحوم گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری باہر پھینکنے کے لئے لے چلے۔ حضرت میاں صاحب نے دیکھا تو پوچھا:

"یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے؟"

انہوں نے جواب دیا: "چھلکے باہر پھینکنے جا رہا ہوں۔"

کہنے لگے: "پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟"

مفتی محمد شفیع نے کہا: "حضرت یہ چھلکے پھینکنا بھی کوئی خصوصی فن ہے، جس کے سیکھنے کی ضرورت ہو"

"جواب دیا: "ہاں تم اس فن سے واقف نہیں لاؤ مجھے دو۔" خود ٹوکری اٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کیے۔ اس کے بعد باہر گئے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر متعین جگہوں پر چھلکے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع کے دریافت کرنے پر بتایا:

"ہمارے مکان کے قرب و جوار میں تمام غرباء مساکین رہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو نان جویں بھی بمشکل میسر آتی ہے۔ اگر وہ پھلوں کے چھلکے یکجا دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی اور اس ایذا دہی کا سبب میں بنوں گا۔ اس لئے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے ہیں اور وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھا لیتے ہیں۔ یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہیں ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔" مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے مولانا محمد ذکی کیفی مرحوم جو اس موقع پر موجود تھے لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھتے ہوں۔ عموماً مہمانوں کے لئے ہی ہوتے تھے، اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود چھلکے گٹھلیوں کو یکجا کرنے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سامان نہ بنیں۔

٭

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا معمول تھا کہ دن بھر تعلیم و تدریس کی محنت اٹھانے کے بعد رات کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور فجر تک نوافل و ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ رمضان المبارک میں رات بھر قیام کا معمول تھا۔ ان کے ہاں تراویح سحری سے ذرا پہلے تک جاری رہتی تھی، اور مختلف حفاظ کئی کئی پارے سناتے تھے یہاں تک کہ ان کے پاؤں پر ورم آجاتا۔ ایک مرتبہ خوراک اور نیند کی کمی اور طویل قیام کے اثر سے ضعف بہت بڑھ گیا اس کے باوجود رات بھر کی تراویح کا یہ معمول ترک نہیں کیا۔ آخر مجبور ہو کر گھر کی خواتین نے امام مولوی کفایت اللہ سے کہلوایا کہ آج کسی بہانے سے تھوڑا پڑھ کر اپنی طبیعت کی کسل اور گرانی کا عذر کر دیجئے۔ شیخ الہندؒ دوسروں کی راحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس لئے خوشی سے یہ عذر منظور کر لیا۔ تراویح ختم ہو گئی اور حافظ صاحب اندر لیٹ گئے اور باہر حضرت شیخ الہندؒ۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو حضرت شیخ الہندؒ تھے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح خلق کی خاص توفیق اور حکیمانہ اسلوب مرحمت فرمایا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی کا واقعہ ہے جو ایک مجلس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے حضرت تھانوی سے ذکر کیا:

"ایک مرتبہ جگر مرادآبادی سے میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے تھانہ بھون جانے اور زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے، مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے مجبور ہوں کیا منہ لے کر وہاں جاؤں۔"

حضرتؒ نے خواجہ صاحبؒ سے پوچھا: پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" خواجہ صاحب نے جواب دیا: میں نے کہہ دیا تھا "ہاں! یہ تو صحیح ہے۔ ایسی حالت میں بزرگوں کے پاس جانا کس طرح مناسب ہو سکتا ہے؟" حضرت نے فرمایا، واہ خواجہ صاحب ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ طریق کو سمجھ گئے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہمارا خیال غلط تھا آپ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہو اسی میں چلے جاؤ، ممکن ہے یہ ملاقات ہی اس بلا سے نجات کا ذریعہ بن جائے۔" خواجہ صاحب واپس گئے تو اتفاق سے ان کی پھر جگر مرادآبادی سے ملاقات ہو گئی اور یہ واقعہ جگر صاحب کو سنایا۔ انہوں نے حضرت کے یہ کلمات سن کر زار و قطار رونا شروع کر دیا اور بالآخر یہ عہد کر لیا کہ اب اگر کبھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، شراب چھوڑ دی۔ اس کے نتیجے میں بیمار پڑ گئے۔ حالت نازک ہو گئی۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ اس حالت میں بقدر ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی، لیکن یہ جگر صاحب کا جگر تھا کہ اس کے باوجود انہوں نے ام الخبائث کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اللہ تعالیٰ اہل ہمت کی مدد کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی مدد سے چند روز بعد شفایاب ہو گئے۔ اس کے بعد تھانہ بھون گئے اور حضرت نے ان کا اکرام فرمایا۔ بشکریہ ہفت روزہ بادبان'

دیوبند کی معروف شخصیت، شیخ الاسلام کی خود نوشت سے چند ایمان پرور اوراق

نقشِ حیات

تصنیف : مولانا حسین احمد مدنیؒ
تلخیص : ناصر وقار

ایک ایسی شخصیت کی زندگی کے نقوش جو دینی علوم ہی میں معروف نہیں، زہد و اخلاص میں بھی یگانہ روزگار تھی

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی سرفروشانہ جدوجہد کا تذکرہ
مصائب و مشکلات پر مبنی آپ بیتی

جب میری عمر چار برس کی ہوئی تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور سپارہ پڑھنا پڑھتا تھا۔ صبح ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانے میں خوب مار پیٹ کرتے تھے۔ اسوقت مجھ کو درجہ آٹھ میں داخل کر دیا گیا۔ (اس زمانہ میں درجوں کی ترتیب اسی طرح تھی۔ مڈل کلاس کو اوّل درجہ کہا جاتا تھا اور سب سے نیچے کا درجہ آٹھواں کہلاتا تھا) چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا۔ ایک بکری بھی والد صاحب نے پال رکھی تھی۔ اسکول جاتے اور واپس آتے ہوئے اس کو اور اس کے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ چونکہ اسکول کا احاطہ بڑا تھا تو وہ لانبی رسّی میں باندھ دی جاتی تھی اور دن بھر اسی طرح چرتی رہتی تھی اور دیگر اوقات فارغہ یا تعطیل میں مکان کے قریب جنگل میں اس کو اور اس کے بچوں کو چرانا پڑتا تھا۔ (اس طرح یہ سنت نبوی علیہ السلام ادا کرنی پڑی تھی) گاؤں میں میرا ہم عمر لڑکا ماموں زاد بھائی جواد حسین مرحوم تھا۔ موقعہ پا کر اس کے ساتھ گولی کھیلنا تھا۔ ایام طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی اور وہ بھی چھُپ لُک کر۔ کھیلنے کی اگر خبر ہو جاتی تو مار پڑتی تھی۔ پتنگ اڑانا یا گیند کھیلنا یا گلی ڈنڈا کھیلنا وغیرہ کبھی وہاں نصیب ہی نہ ہوا۔ پانچویں سپارہ تک والدہ مرحومہ سے اور پانچ سے اخیر تک والد مرحوم سے قرآن شریف ناظرہ پڑھنا ہوا۔ اس کے بعد آمد نامہ دستور الصبیان گلستان کا کچھ حصہ مکان پر پڑھنا ہوا اور اسکول میں دوم درجہ تک پڑھنا ہوا۔ تمام اقسام حساب جبر و مقابلہ تمام جغرافیہ عمومی و خصوصی تاریخ عمومی و خصوصی، تحریر، املا، شکست لکھنا اور پڑھنا، اردو کورس وغیرہ سب اسی عمر میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمات

جب میری عمر کا تیرھواں سال شروع ہوا تو بھائی سید احمد صاحب مرحوم اردو مڈل کلاس پاس کر کے ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم بھیج دیے گئے۔ بڑے بھائی صاحب پہلے سے وہاں پڑھتے تھے۔ والد صاحب نے بھائی صاحب کی روانگی کے تین ماہ بعد جناب منشی فیروز الدین صاحب بٹالوی مرحوم کے ساتھ مجھے بھی دیوبند بھیج دیا۔ منشی صاحب والد مرحوم کے بہت زیادہ دوست اور فیض آباد محافظ دفتر تھے اور والد صاحب کے پیر بھائی بھی تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی۔

دیوبند پہنچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی وہ بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی صاحبان اور بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے۔ والد صاحب مرحوم تو ممکن ہے کہ ان کو مارتے وقت یا بعد میں کچھ شفقت آ جاتی ہو مگر یہاں تو وہ بھی نہیں تھی۔ بہرحال اس تقلید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو و لعب کا شغف کم سے کم کر دیا۔

بھائی صاحب مرحوم نے گلستاں کے تو شاید ایک یا دو سبق پڑھائے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی۔ جب دونوں خوب یاد ہوگئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے پاس یکے بعد دیگرے پڑھیں۔ اس طرح مجھے جلد ترقی کرنے کا موقع ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل ہوا گیا۔ اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذہ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں۔ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا۔

ابتدا ابتدا میں مجھ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا۔ پھر علم ادب سے شغف ہوگیا۔ جب علم حدیث سے شغف ہوا تو پہلے دونوں شغفوں میں کمی آگئی اور علم حدیث کے انہماک ہی میں دورِ طالب علمی ختم ہوگیا۔

ہندوستان سے مدینہ منورہ کا سفر:

۱۳۱۶ھ میں جبکہ میں اکثر کتب درسیہ سے فارغ ہوچکا تھا، والد صاحب مرحوم کا سامان سفرِ حجاز و عرب مکمل ہوگیا۔ ہم الٰہ آباد، گوالندو، چاندپور ہوتے ہوئے چاٹگام پہنچے۔ پھر بحری جہاز پر تقریباً سترہ اٹھارہ دن سفر کرکے کامران پہنچے۔ وہاں سے روانگی کے تیسرے دن جہاز جدہ پہنچا۔ بالآخر ذیقعدہ کی ۲۴ یا ۲۵ تاریخ کو مکہ معظمہ پہنچے۔ حج اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے بعد غالباً ۲۵ یا ۲۶ ذوالحجہ کو مدینہ کو روانگی ہوئی اور تقریباً بارھویں دن محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور علیہ السلام حاصل ہوا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔

۱۳۱۸ھ شوال تک میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔

۱۳۱۸ھ ذیقعدہ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ ماہ محرم میں واپس مدینہ پہنچا۔ اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر شروع ہوا۔ خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، اولیائے عظامؒ اور جناب باری عز اسمہٗ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

والد صاحب مرحوم کی اولاد ایک لڑکی اور ہم پانچ لڑکے جو کہ بوقتِ سفرِ مدینہ منورہ موجود اور زندہ تھے۔ ان میں سے تین کی شادیاں ہندوستان میں ہوچکی تھیں۔ بڑے بھائی صاحب، صاحبِ اولاد بھی تھے۔ میں جس وقت ۱۳۱۸ھ کے آخر میں گنگوہ شریف کو روانہ ہوا تو گھر میں حمل تھا۔ میرے سفر کے ایام میں بچی پیدا ہوئی۔ جب ہم ہندوستان سے واپس آئے تو کچھ دنوں کے بعد میری بچی کا انتقال ہوگیا۔

۱۳۲۶ھ کے ابتداء میں میری پہلی اہلیہ مرض دق وسل میں مبتلا ہوکر چند مہینے بیمار رہ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔ ایک لڑکی زہرہ جو کہ ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئی تھی چھوڑ گئی جو کہ ۱۳۳۷ھ میں بمقام دمشق فوت ہوگئی۔

نکاح ثانی کے لئے میرا سفر ہندوستان

۱۳۲۶ھ میں جبکہ میری پہلی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا، والد صاحب مرحوم نے فرمایا مجھ کو ہندوستان جانا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا۔ مگر وطن میں کوئی شخص رشتہ داروں میں سے لڑکی دینے پر راضی نہ ہوا اور یہ جواب سب نے دیا کہ اگر ہندوستان ہی میں قیام کرے تو ہم عقد کرنے کو تیار ہیں، مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ نکاح کرکے لڑکی مدینہ منورہ لے جائے۔ آخر حافظ زاہد حسین صاحب کی عنایات سے حکیم غلام احمد صاحب اپنی منجھلی لڑکی ان شرائط پر دینے کو تیار ہو گئے کہ عقد نکاح میں تمام بڑے اساتذہ اور حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم اور مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم شرکت فرمائیں اور حسین احمد جب بھی ہندوستان سے حجاز جائے تو ایک یا دو برس رہنے کے بعد ایک مرتبہ مع اہلیہ یہاں آئے۔ ان دونوں شرطوں میں مجھے پس و پیش ہوئی، مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ راضی اور متکفل ہوگئے۔ چنانچہ عقد ہوگیا اور حسب شرط سب حضرات وہاں تشریف لے گئے۔ مرحومہ سے دو لڑکے الطاف احمد اور اشفاق احمد پیدا ہوئے اور یکے بعد دیگرے معہ اپنی ماں کے ایام اسارت مالٹا میں وفات پاکر مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔ ہر دو خورد سالی میں فوت ہوئے۔

دوسرے نکاح کے بعد اہلیہ سمیت حضرتؒ کے مکان پر ہی رہا۔ سفر و حضر میں بھی حضرت کا ساتھ رہا اور دارالعلوم دیوبند میں سلسلہ تدریس ملازم بھی ہوگیا۔

دارالعلوم کی مدرسی اور جلسہ دستار بندی

۱۳۲۷ھ شعبان تک دارالعلوم میں کتب دورہ میں سے ترمذی اور بخاری شریف کو جد و جہد کے ساتھ پڑھتا رہا۔ ۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا۔ جلسہ اہل شوریٰ نے اس تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۲۴ روپے ماہوار مدرس کر دیا جائے؛ اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان میں آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے۔ چنانچہ مجھ کو متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیے گئے۔ اس سے مجھ کو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوگئی اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت شیخ الہندؒ جب سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف

خدمت گزاری سے باریابی ہوتی۔ ۱۳۲۸ھ میں تجویز ہوا کہ دستار بندی کا جلسہ عرصہ دراز سے نہیں ہوا ہے اس کو عمل میں لانا چاہیئے۔

دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری کیا گیا۔ دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستور بندی اور سند اور امتحان اور تقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دارالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانے پر پیدا ہو گیا۔

۱۶۔۱۷۔۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء جلسہ کا اعلان کر دیا گیا۔ ضروریات جلسہ کے لئے اطراف و جوانب سے چندہ کر کے اٹھارہ بیس ہزار روپے جمع ہو گئے۔ مہمانی کے لئے نہایت بڑے پیمانہ پر مطبخ بنایا گیا۔ اس زمانہ میں اخباروں نے جلسہ کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کئے۔ میرے ذمہ طلبہ کو عربی میں تقریر کرانے کی خدمت تعیین کی گئی تھی لیکن عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہئیں۔ عربی میں دو تین طلبہ نے تقریر کی۔ بعدازاں ارباب انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کرا دیں اور اردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا سب سے پہلے حضرت مولانا شاہ صاحب رح کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔

مجھ کو ایک عمامہ سبز حسب اصول مدرسہ دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے از دست حضرت شیخ الہند رح بندھوایا گیا اور مجھ کو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب، صاحبزادہ حضرت قطب العالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری دستار عطا فرمائی۔ پھر جناب مولانا احمد صاحب رامپوری رکن مجلس شوریٰ نے تیسری دستار عطا فرمائی۔

ہندوستان سے واپسی حجاز

چونکہ مدینہ منورہ میں والد صاحب مرحوم اور دیگر اعزہ موجود تھے اس لئے طبعی تقاضا وہاں پہنچنے کا علاوہ اس روحانی تقاضے کے جو کہ ان دیار مقدسہ کی حاضری کا ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے جاری تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر حضرت والد صاحب مرحوم کا آئے دن کا حکم تھا کہ جلد از جلد یہاں پہنچنا چاہیئے۔ اسی بنا پر ۱۳۲۹ھ میں ارادہ سفر حجاز کیا گیا۔ غالباً اٹھارہ دن میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

اوائل ۱۳۳۱ھ میں اپنی اہلیہ کو ماں اور بہنوں سے ملاقات کرانے کے لئے حسب شرط ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا گیا۔

پھر اواخر ۱۳۳۱ھ میں واپسی کا سامان کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ پھر ترکی کا اعلان جنگ بھی ہو گیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ کر مشاغل تعلیمیہ وغیرہ میں حسب سابق مشغول ہو گیا۔ اسی اثنا میں جبکہ ترکی فوجیں حدود مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین اور والنٹیروں کی بھرتی کی جا رہی تھی تو ترغیب جہاد کے لئے مناخہ مدینہ منورہ میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔

سیاست سے میرا تعلق

یہاں تک ذاتی اور خانگی حالات تھے۔ اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا" یعنی سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلے میں عزم انقلاب"۔ جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز تھے، ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے وہ افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصہ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پرنور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔

انگریزی دور اور سماجی تباہی و بربادی

پنڈت سندر لال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں فرماتے ہیں:

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی، اور مذاہب کے نیز کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔

مگر جب سے انگریزی راج شروع ہوا اسی وقت سے ہندوستانیوں کی قومی توہین اور تذلیل اور نسل اور وطن امتیاز اور رنگت اور یورپین اور نیٹو (دیسی) کا ذلیل کرنے والا تفرقہ شروع ہوا، جو کہ طاقت اور قوت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا انتہائی درجہ کو پہنچ گیا۔ انگریزی راج نے ہندوستان کی تمام خوبیوں کو تقریباً مٹا دیا اور ان کی بجائے تمام بداخلاقیاں اور برائیاں پیدا کر دیں۔

لفظ "وہابی" اور انگریزی پروپگنڈہ

سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے اوائل زمانہ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہو چکا تھا اور انہوں نے دس برس مکہ معظمہ میں اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی۔ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار تھے۔ انہوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کئے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا۔ اسی لئے

اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔ بالآخر سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے خدیوی محمد پاشا مرحوم والیٔ مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہل نجد کو حجاز سے نکالے چنانچہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا اور اس نے نجدیوں کے قبضہ سے حجاز کو واگزاشت کیا۔ اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہوا اسکو وہابیت کی طرف منسوب کردیا۔ اہل حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہوگئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا۔

انگریزوں کے سفاکانہ مظالم نے عام مسلمانوں بالخصوص علمی طبقہ میں آزادی کی عام تڑپ پیدا کی۔ ۱۸۰۳ء میں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقہ پر لکھوا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ:

"خلق ہے خدا کا، ملک ہے بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی ہے بہادر کا"

تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہوجانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادیٔ ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔

تحریک استخلاص وطن کی ابتداء

شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلو خلاصی چاہتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے ارشاد و ہدایات سے جس انقلابی پارٹی کی داغ بیل ڈالی تھی آخر کار اس نے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سید احمد صاحب شہیدؒ اور ان کی جماعت کے روپ میں جنم لیا۔ حضرت سید صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی نواہائے آتشیں سے تمام ملک میں آگ لگا کر ایک ایسی بڑی جمعیت پیدا کرلی جو ملک کو ہر قسم کے شر و فساد اور ظلم و جور سے پاک صاف کردے اور مسلمان دوسرے ارباب مذہب کے ساتھ عزت و خودداری کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک

یہ زمانہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا تھا۔ سید صاحبؒ کو مسلسل اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ مہاراجہ کی حکومت میں مسلمانوں پر ناگفتنی مظالم ہو رہے ہیں اور ان کے شعائر مذہبی کی علانیہ توہین ہو رہی ہے اور عرصۂ حیات ان پر تنگ کردیا گیا ہے۔ آپؒ نے اپنے خلیفہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو ان واقعات کی تحقیق کے لئے پنجاب روانہ کیا اور آخر جب انہوں نے چشم دید حالات دیکھنے کے بعد ان واقعات و مظالم کی تصدیق کردی تو آپ نے پنجاب کا رخ کیا۔ سید احمد شہیدؒ نے صاف فرمایا کہ:

"کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔"

ہندوستان کی یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانان پنجاب کی حد درجہ پامالی اور زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر کار بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا، ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔

ہمارے اکابر کا ۵۷ء کی تحریک میں حصہ

ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند، سہارنپور و مظفر نگر) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے تلامذہ کے شاگرد اور خوشہ چین رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں۔ چنانچہ جب سید صاحب کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب شہید ولائتی (دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی) اور بہت سے حضرات (اطراف سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جا کر شہید ہوئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے بھی اس جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو وحشیانہ مظالم اور جس درندگی کا مظاہرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سخت دل اور وحشی انگریزوں نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس سے برطانوی حکومت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہاں کی ذمہ دار جماعتوں اور سمجھدار حکام کو ضروری معلوم ہوا کہ ہندوستان کی حکومت کی باگ ان تجارت پیشہ لوگوں اور خود غرض حریصوں کے ہاتھ سے نکالنی ضروری ہے ورنہ تمام انگلش قوم اور برطانوی تاج دنیا بھر میں بدنام ہوجائیں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کوئین وکٹوریہ کا مشہور اعلان نافذ کیا گیا۔ مجرمین اور مشتبہین کے معاف کردینے کا عام اعلان ہوا اور حسب قابلیت بغیر تفرقۂ مذہب و نسل و رنگت تمام عہدہ ہائے ملکیہ سب کو دینے کا اور سب کے ساتھ برابر

برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

اس اعلان پر ہندوستان میں امن اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ چاروں طرف رعایا مطمئن ہو گئی۔ مگر بعد کے کچھ عرصہ کے معاملات نے واضح کر دیا کہ یہ اعلان محض ہاتھی کے دانت کی طرح تھا، جو محض دکھلاوے کا کام کرتا ہے۔ تمام حکام وہی رکھے گئے جن کے ہاتھ ہندوستانیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور جن کی سرشت میں درندگی اور بربریت بھری ہوئی تھی اور جو کہ ہندوستانیوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور پہلا اجلاس اس کا بمبئی میں کیا گیا اور اس میں بلا تفریق مذہب و نسل ہندوستانیوں کو ممبر بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اس اجلاس میں ۷۸ ممبر شریک ہوئے جن میں دو مسلمان، تین بنگالی اور باقی بمبئی کے باشندے ہندو اور پارسی وغیرہ تھے۔

۱۸۸۶ء میں جب کانگریس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں ہوا تو ممبروں کی تعداد ۷۸ سے بڑھ کر ایک ہی سال میں (۴۳۶) ہو گئی جس میں مسلمان (۳۳) تھے۔ اور پھر ۱۸۸۷ء میں جب اس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہوا تو ممبروں کی تعداد (۶۰۴) تھی، جن میں مسلمان (۸۳) تھے۔ کانگریس کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر مسٹر بیک پرنسپل علیگڑھ کالج اور دوسرے انگریزوں کو انتہائی بے چینی نے گھیر لیا۔ چنانچہ انہوں نے انجمن محبانِ وطن (انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن) کی بنیاد ڈالی۔ اور سرسید پر اسقدر اثر اور دباؤ ڈالا کہ وہ انتہائی درجہ کانگریس کے مخالف ہو گئے۔ چند علماء کو اپنا ہم خیال بنا کر فتویٰ شائع کرایا۔ جس کی رو سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت حرام قرار دیدی گئی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت فرض بتائی گئی۔ یہ تمام معاملہ ۱۸۸۸ء سے پُرزور طریقہ پر جاری ہوا۔ اس پر مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور مدرسین دارالعلوم دیوبند اور بہت سے علماء حقانی اطراف و جوانب ہند نے پُرزور مخالفت کی اور کانگریس کی شرکت کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی شرکت کی ممانعت میں فتوے لکھے۔ اس بارہ میں پیش پیش علماء لدھیانہ مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب مرحومین تھے۔ انہوں نے اطراف و جوانب ہندوستان سے فتاویٰ منگوائے اور ان سب کو ایک رسالہ "نصرۃ الابرار" میں جمع کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز

حضرت شیخ الہندؒ کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ حضرتؒ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا اور فوراً روانہ ہو گئے۔ وہاں گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی۔ انہوں نے حضرت شیخ کو تحریک آزادی کے متعلق ہدایات دیں کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

میرا سیاست میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ مشن آزادیٔ ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ یہ وقت میری سیاست کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔

مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں۔ اس لئے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقا بھی جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے، تاہم جب حضرت کا تقاضہ شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے مگر تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے۔ پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے، وہاں سے گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ بیانات لینے اور سوالات کرنے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان، کابل فرنٹیئر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے۔ جیزہ کے جیل میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء کو ہم مالٹا روانہ کر دیے گئے۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی رہی۔ تقریباً تین برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو اسکندریہ پہنچے۔ ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے۔ یہاں پونے دو مہینے کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو بذریعہ جہاز عدن پہنچے۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا

تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دیدیا جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسب ذیل تھے:

"ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے"

مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد ہم کو بمبئی پہنچا کر رہا کیا گیا۔

خلافت کمیٹی کے استقبالیہ کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا۔ اس نے کہا: مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ مگر جب وہ بذریعہ لانچ کنارہ پر پہنچے تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا کو گونجا دیا اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کار میں سوار کر کے اپنے قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ ارکان حضرت کے مذاق آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہموا تھے اس لئے بالطبع ان سے رل مل گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔

جلسۂ عام اور سپاسنامہ

مسلمانان بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسۂ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں "ایڈریس" پیش کیا گیا۔

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی تیانگا پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی۔ ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصے میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔

ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹا پڑتا تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر سے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنا اور آپ سے معانقہ کرنا جوئے شیر سے کم دشوار نہ تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری اور وصال

حضرت شیخ الہندؒ گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے۔ علاوہ اس کے بواسیر، کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں۔ سردیوں میں مرض ترقی کر جاتا تھا۔

چونکہ میں ۱۳۲۸ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیہ اولیٰ برائے عقد ثانی آیا تھا۔ انہی دنوں میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا۔ میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہنچا کہ:

"میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں تو مجھ سے علی گڑھ میں مل"

تحریک خلافت کا زور تھا۔ ترک موالات کا جوش تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کرے۔ مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیان یونیورسٹی کب اسکو گوارا کر سکتے تھے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

میں علیگڑھ میں حضرت سے ملا۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا۔ وہاں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت نے علالت کے باوجود شرکت اور صدارت فرمائی۔ اجلاس مذکورہ سے فارغ ہو کر حضرت دہلی تشریف لائے اور جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

۱۴ ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی۔ ۱۵ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہو گئی۔ بخار بہت تیز ہو گیا۔ حالت اگرچہ تشویشناک تھی تاہم ہوش و حواس بجا تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ رات بھر یہی حالت رہی۔ ۱۸ ربیع الاول سات بجے کے بعد بہت تغیر ہو گیا اور حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ حضرتؒ نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ:

"مرنے کا تو افسوس نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے۔"

اس کے بعد بلند آواز سے "اللہ اللہ" سات مرتبہ کہا۔ مولوی مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۂ یٰسین شروع کی۔ پھر مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا اور خاص "الیہ ترجعون" کی آواز پر قلب

شاہ بخاری فاضل حقانی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
اور
شاہ فیصل ایوارڈ

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن اور عالم اسلام کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو حال ہی میں شاہ فیصل فاؤنڈیشن نے ان کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف وتحسین کے طور پر یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس عظیم اعزاز وتکریم سے برصغیر کے علمی و دینی حلقوں کو خصوصی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ عصر حاضر میں استعماری طاقتوں کے جراثیم کو ختم کرنے کے لئے مؤثر جدوجہد اور مادیت پرستی، مغربی تہذیب وتمدن اور الحادی فتنوں کے تعاقب میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جو عظیم خدمات ہیں وہ مخفی نہیں۔ عالمی سطح پر اس مہم میں انہیں امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کے دلی خلوص اور جذبات وخدمات کا سلسلہ ارض ہند سے شروع ہو کر دنیا کے کونے کونے میں تحریر و تقریر کے ذریعہ موجود ہے۔ وہ بے مثل کردار کے مالک ہیں۔ حق گوئی اور اصلاح جدوجہد میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مختلف ممالک کے سربراہوں اور وزیروں سے لے کر مختلف تحریکوں کے چوٹی کے رہنماؤں کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے رہے ہیں؛ اور اس سلسلہ میں کبھی بھی ذاتی مفاد کو ترجیح نہیں دی۔ عالم عرب کی کمزوریوں اور بیماریوں اور اس کے سر پہ منڈلانے والے خطرات سے جو واقفیت علی میاں کو حاصل ہے؛ وہ برصغیر میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوگی۔ ۱۹۴۷ء میں سرزمین عرب پر قدم رکھنے سے قبل بھی وہ وہاں کی تحریکات، رجحانات، مکاتب خیال اور شخصیتوں سے اتنا واقف تھے کہ انہیں کسی عرب ملک میں بھی کبھی بیگانگی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ اس کے بعد بار بار مشرق وسطیٰ کا دورہ کر کے پوری عرب دنیا کی سیاحت کی، بقول ان کے سیاحت بھی زائرانہ نہیں بلکہ عربی دنیا کے تمام اہم مرکزوں میں مہینوں اور ہفتوں رہ کر ایک فرد خاندان کی حیثیت ان کی زندگی کے مطالعہ اور ان کے حقیقی خیالات وجذبات سے واقفیت حاصل کی۔ عربوں کی عالی ظرفی طبعی شرافت۔ کریم النفسی اور اخوت اسلامی کا کرشمہ تھا کہ انہیں ایک فرد خاندان کی طرح اپنے حالات پر تبصرہ اور تنقید کرنے، اپنے مسائل پر بحث کرنے اور ان کا حل پیش کرنے کی اجازت دی؛ اور اس کو نہ صرف خندہ پیشانی اور بشاشت کے ساتھ سُنا بلکہ ان کے خیالات کی اشاعت اور توسیع کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ چنانچہ اس طرح کی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو علی میاں نے دمشق یونیورسٹی کے ہال میں ممبران پارلیمنٹ، اساتذۂ جامعہ اور عمائد شہر کے جلسہ میں جس کی صدارت یونیورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر مشہور عرب فاضل قسطنطین زریق کر رہے تھے فلسطین کے مسئلہ اور اس کے حل پر مقالہ پڑھا، جو "فلسطین کے المیے کے بنیادی اسباب" کے نام سے دمشق بیروت اور بغداد میں بار بار چھپا ہے۔ مقالہ میں موجودہ عربوں کی بنیادی کمزوریوں اور ان کے رہنماؤں کی خامیاں اور کوتاہیوں پر آزادانہ تنقید کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین کا حل پیش کیا تھا۔ عربوں نے اس مشورہ کو جو ایک مسافر اور ایک غیر ملکی کی زبان سے پیش ہوا تھا اور جس میں تنقید کی تلخی بھی تھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ:

"یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔
باہر کے کسی آدمی کو مشورہ دینے
کا کیا حق ہے۔"

اور نہ وہ اس صاف گوئی اور احتساب پر چیں بہ جبیں ہوئے۔

اسی طرح ۵۶ء میں موتمر اسلامی دمشق کے جلسہ میں "مسئلہ فلسطین کا تعلق عالم اسلام کے دینی شعور کی بیداری سے" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا اور اس کو اسی طرح پذیرائی ہوئی۔ اسی طرح دمشق۔ بیروت۔ عمان، بغداد اور مکہ معظمہ میں عرب دوستوں کے سامنے اپنے ناقدانہ خیالات، اپنے مخلصانہ مشورے اور اپنے تاثرات وجذبات پیش کئے ہیں؛ اور

انہوں نے ہمیشہ فراخدلی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

مرا اسار گرچہ ستم رسیدہ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

مولانا کی مشہور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کی عروج و زوال کا اثر" جسکا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی اور ترکی زبان میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ عربی ایڈیشن کا نام: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ہے جو سعودی عرب کے مختلف کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ۷۶ء تک کویت سے اس کے آٹھ ایڈیشن، انگریزی میں (ISLAM AND THE WORLD) کے نام سے دو فارسی میں "مسلمین دنیا در خطر سقوط" کے نام سے دو، ترکی زبان میں دو اور اردو زبان میں نو (۹) ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا دنیائے عرب و عجم کا ایک مشترکہ اور انمول سرمایہ ہیں۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل فاؤنڈیشن کی طرف سے شاہ فیصل ایوارڈ کے لئے بہترا انتخاب پر سعودی حکومت مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس موقع پر مولانا صاحب نے شاہ فیصل ایوارڈ کے ساتھ دی گئی دو لاکھ سعودی ریال یعنی تقریباً چھ لاکھ پاکستانی روپے کی انعامی رقم افغانستان کے مجاہدین اور پناہ گزینوں اور علوم قرآن کی اشاعت اداروں میں تقسیم کر کے ایثار کی مثال قائم کر دی ہے اور بقول مدیر "الحق" "ہمارے اکابر کا یہی وہ شعار اور ایثار رہے جس نے ہر دور میں معاشرہ پر گہرے نقوش اور انقلابی اثرات مرتب کئے۔ اس طرح ہم قافلہ علماء حق کے جانثار اور پاکستانی عوام کی طرف سے شاہ فیصل فاؤنڈیشن کے انتخاب اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور انکی طویل حیات اور صحت کیلئے دست بدعا ہیں۔

بقیہ: نقشِ حیات

ہو کر ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرا دیوبند پہنچنا:۔

حضرتؒ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے روز میں امروہہ پہنچا اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہنچا کہ حضرت کا وصال ہو گیا اور جنازہ دیوبند جا رہا ہے۔ میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کر لیا۔ شام کی گاڑی نکل چکی تھی، اس لئے رات کی گاڑی ملی اور میں صبح کو تقریباً نو بجے دیوبند پہنچا۔ حضرتؒ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آ رہے ہیں۔ اپنی بدقسمتی اور بیچارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں، نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا۔

اس کے بعد کلکتہ پہنچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لئے مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اطراف و جوانب کلکتہ بکثرت جلسہ ہو رہے تھے۔ ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا۔ مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگریس و خلافت کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے تھے۔ اسی طرح سیوہارہ ضلع بجنور کے جلسے، سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسے اور اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قید بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اس تحریر کی ابتدا نینی جیل میں ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی خدا خدا کر کے بڑی مشکلوں سے ۱۹۵۲ء کے آغاز میں یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر اختتام کو پہنچی۔ اس کا موقع بھی میسر نہ آسکا کہ نظر ثانی کر سکوں۔ بہر حال جو کچھ ہے پیش خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

ہر قسم کی
اصلاحی، تاریخی و دینی کتابوں
کی بارعایت خریداری کے لئے تشریف لائیں۔
نیز
سامان سٹیشنری
کھیلوں کا سامان، سکول و کالج کی درسی
کتابوں کی تھوک و پرچون خریداری
کے لئے ہمیں
خدمت کا موقع دیں۔
مکتبہ معین العلم
ہارون آباد۔ ضلع بہاولنگر

خوشخبری
ہم اپنے کرمفرماؤں کو یہ خوشخبری سناتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ ہم موٹر سائیکل کاواساکی۔ یاماہا۔ سوزوکی اور ہنڈا کے مختلف سائز میں
کیریئر
مارکیٹ میں لا رہے ہیں۔ اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔ سالہا سال سے سائیکلوں کے خوبصورت اور پائیدار سٹینڈ کیریئر پیش کرنے والے
پروپرائٹر محمد نسیم بھٹی الفرید سٹیل پروڈکشن
پاکپتن روڈ۔ عارف والا ساہیوال

حافظ ارشاد احمد دیوبندی

امین الامت

مرقع للتہنیت

فاتح روم

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وفات ۱۸ھ

ولکل اُمۃٍ امین وامین ھذہ الامۃِ ابُوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

امین الامت فاتح شام سپہ سالار اعظم لشکر اسلام سیدنا حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ایک جلیل القدر والسابقون الاوّلون کی یادگار عظیم الشان کارناموں کے مالک بہت ہی زیادہ مشہور صحابیٔ رسول ہیں۔ آپؓ کے پاک تصوّر کے دل میں آتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ دشمنِ اسلام کفار کی گردنیں ہمارے سامنے گاجر مولی کی طرح کٹتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ کفار آپؓ کی اسلامی ہیبت اور رعب سے لرزاں ہیں اور صلح کی شرائط پر آمادہ۔ مگر اسلام کا یہ جری سپاہی صرف تین اسلامی شرائط کے علاوہ اور کسی شرط کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں:

۱۔ قبول اسلام

۲۔ جزیہ یا پھر

۳۔ تلوار

اس کے علاوہ اور کوئی شرط منظور نہیں کی جاسکتی۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح بھی ان دس خوش قسمت اصحابؓ محمد علیہ السّلام میں سے ہیں جن کو بارگاہِ نبوّت نے اپنی زبان مقدس سے دنیا ہی میں جنت کے دخول کا پروانہ عطا فرما کر خوشخبری سُنا دی تھی۔

ابوداؤد اور ترمذی شریف میں حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے جب ان کو معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا رضؓ کی بُرائی بیان کرتے ہیں تو سعید بن زیدؓ نے فرمایا:

"نہایت ہی افسوس ہے کہ آج کل اصحابؓ رسول علیہ السّلام کو بھی بُرا کہا جارہا ہے (یعنی نشانۂ تنقید بنایا جاتا ہے) اور تم خاموشی سے گوارہ کررہے ہو (یعنی تم نکیر بھی نہیں کرتے) میں جو ابھی حدیث بیان کرنے والا ہوں یہ خود آنحضرت نبی کریم علیہ السّلام سے اپنے کانوں سے سُنی ہے اور مجھے حضرت علیہ السّلام کی طرف کوئی جعلی بات منسوب کرنے کی ضرورت ہی نہیں جو آپ علیہ السّلام نے نہ فرمائی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قیامت کے روز (میں آپ علیہ السّلام کی طرف کوئی بات منسوب کرکے) آپ علیہ السّلام کی ملاقات کیسے کرسکتا ہوں۔ پھر اس تمہید کے بعد آپؓ نے یہ حدیث بیان فرمائی کہ "ابوبکرؓ جنت میں ہیں، عمرؓ جنت میں ہیں، عثمانؓ جنت میں ہیں، علیؓ جنت میں ہیں، زبیرؓ جنت میں ہیں۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ جنت میں ہیں، طلحہ الخیرؓ جنت میں ہیں، سعد بن ابی وقاصؓ جنت میں ہیں، عبد الرحمٰن بن عوفؓ جنت میں ہیں۔ تو یہ نوؓ صحابی بنتے ہیں۔ چونکہ دسویں آپؓ خود تھے اس لئے کسرِ نفسی سے اپنا نام ذکر نہ فرمایا، مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھ گیا کہ دسویںؓ کون ہیں تو فرمایا کہ سعید بن زیدؓ۔ انہی سعید بن زیدؓ کا قول منقول ہے کہ فرماتے:

"واللہ العظیم صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں اسؓ کا چہرہ غبار آلود ہوجائے، غیر صحابہؓ سے ہر شخص کی عمر بھر کی عبادت و عمل سے بہتر ہے، اگرچہ اس کی عمر حضرت نوحؑ کی عمر کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔

اِسی طرح انہی مقدس عشرہ مبشرہ حضراتؓ کے رتبے اور حقوق کے تحفظ کے لیے بھی حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے امت کو توجہ دلائی تھی۔ پھر ہر دَور میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے علماء حق نے صحابہ کرامؓ کے عظیم مرتبہ و عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے عہد میں لوگوں کو خبردار رکھا اور واضح کیا کہ جو اس مقدس جماعت جنہیں قرآن کریم نے "حزب اللہ" (اللہ کی جماعت) فرمایا ہے ان سے عداوت رکھے گا یا ان کی

شان میں تجاوز کرے گا ان کا اسلام ہی مشکوک ہے اور حضرت امام مسلمؒ کے استاد حضرت امام ابو زرعہؒ کا فرمان تو صحابہ کرامؓ کے متعلق یوں ہے کہ:

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی بھی تنقیص کر رہا ہے "فاعلموانہ زندیق" تو سمجھ لے کہ وہ زندیق اور بے دین ہے۔"

نیز "شفاء" میں امام اعظمؒ کا قول یوں منقول ہے کہ:

"جو شخص صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بھی خصوصاً ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، معاویہؓ یا عمرو بن العاصؓ کو برا کہے، پھر اگر وہ کہتا ہے کہ وہ گمراہی یا کفر پر تھے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور اگر ان کے علاوہ عام گالیوں میں سے کوئی گالی دے تو اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔"

حضرت ابو عبیدہؓ کو مشاہیر صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ بھی بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپؓ کا نام نامی و اسم گرامی عامر تھا اور باپ کا نام عبداللہ، دادا کا نام الجراح یعنی عامر بن عبداللہ بن الجراح۔ کنیت ابو عبیدہ تھی، مگر آپؓ باپ کی بجائے دادا کے نام سے مشہور ہوئے اس لئے آپ کو ابو عبیدہ بن الجراح ہی کہا جاتا ہے۔ آپؓ کو لقب خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "امین الامت" کا عطا فرمایا تھا۔ پانچویں پشت میں آپؓ کا سلسلۂ نسب یعنی "فہر" آنحضرت علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی کوشش سے اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ صدیق اکبرؓ نے ہی آپؓ کو بارگاہ نبوت (علیہ السلام) میں پیش فرمایا تو اس خوش قسمت سعید الفطرت نے فوراً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت فرمالی۔ اس کے بعد پھر ساری زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی۔ اس وقت اسلام قبول کرنا اپنے آپ کو مصائب میں گرفتار کرانے کے مترادف تھا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے بھی اپنے آپ کو مصائب میں ڈال کر اللہ اور اللہ کے رسول علیہ السلام کی خوشنودی کے لئے کمر ہاتھ باندھ لی۔ بڑی سے بڑی مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے رہے۔ آخر جب حضرت نبی کریم علیہ السلام نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت عطا فرما دی تو آپؓ بھی دوسرے قافلہ میں شریک ہو کر حبشہ ہجرت فرما گئے تھے، مگر تھوڑے دنوں کے بعد آپؓ واپس مکہ مکرمہ تشریف لے آئے تھے اور پھر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت مستقلاً مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے۔ مدینہ منورہ میں مہاجرین اصحاب کرامؓ کو معاشی تکالیف نے کافی پریشان کئے رکھا، کیونکہ مکہ مکرمہ میں جائیداد وغیرہ چھوڑ گئے تھے اور مکان وغیرہ بھی مدینہ منورہ میں ابتداء میں ان کے نہیں تھے، اس لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے متمول انصار صحابہ کرامؓ کا ان کو بھائی بنا دیا تھا تاکہ ضروریات زندگی میں وہ ان کی فی الحال کفایت کریں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابو عبیدہؓ کو حضرت سعد بن معاذؓ کا دینی بھائی بنایا گیا تھا۔ اس دینی رشتہ کی نسبت سے ان دونوں حضرات کے تعلقات عمر بھر بڑے عمدہ رہے۔

مدینہ منورہ میں مسلمانوں نے ابھی تک پوری طرح اپنے اپنے ٹھکانے بھی تیار نہیں کئے تھے کہ کفار مکہ نے ان کو مدینہ میں بھی امن کے ساتھ رہنے نہ دیا بلکہ آئے دن کئی قسم کی خطرناک سازشیں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ کی پہلی بڑی جنگ میدان بدر میں لڑی گئی جبکہ مسلمانوں کی مالی اور حربی طاقت صفر ہی تھی مگر ایمان کا جذبہ ۳۱۳ صحابہ کرامؓ کو میدان جنگ میں لے آیا جبکہ باطل کی طرف سے ایک ہزار مع سامان جنگ مقابلہ میں تھے۔ جانبین کی قوت کا بظاہر اندازہ کر کے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور سر بسجدہ ہو کر دعا فرما رہے تھے:

"یا اللہ یہ صرف تین سو تیرہ ہماری کل طاقت ہے! اگر یہ بھی دنیا کی ہستی سے مٹ گئے تو۔۔۔"

کفر و اسلام کا یہ نظارہ اب بھی جب تصورات سے آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو حق کی فتح کی مسرت میں خوشی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں جس میں باپ بیٹا، بھائی بھائی اور بڑے خونی رشتے ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کے والد عبداللہ بن الجراح بھی اس جنگ میں کفار کی طرف سے موجود تھا۔ جونہی اس جنگ کا معرکۂ کارزار گرم ہوا حضرت ابو عبیدہؓ پہلے تو والد کو طرح دے کر نکل گئے مگر اسلام کی محبت رشتے کی محبت پر غالب ہو گئی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے ایک ہی وار میں باپ کی گردن اڑا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ — قرآن کریم کی آیت مبارکہ

لا تجد قوما یؤمنون باللہ۔
۔۔۔تا آخر سورت مجادلہ تک

پ ۲۸ تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے ایمان اور ان کی مدد کی اپنے غیب کے فیض سے اور داخل کرے گا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں۔ ہمیشہ رہیں گے ان میں اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا سنتا ہے جو گروہ ہے (الشکر

اللہ کا وہی مراد کو پہنچے۔

(ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

حضرت مفسرِ اعظم مولانا شیخ الاسلام حضرت عثمانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

صحابہ کرامؓ کی شان یہ تھی کہ اللہ و رسول علیہ السلام کے معاملے میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی۔ اسی سلسلہ میں ابوعبیدہؓ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ جنگ احد میں ابوبکر صدیقؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے مقابلے میں نکلنے کو تیار ہو گئے (مگر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بعد میں مسلمان ہوئے) "راقم" اور مصعب بن عمیرؓ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو، عمرؓ بن الخطاب نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو، علیؓ بن ابی طالب نے حمزہؓ، عبیدہؓ بن الحارث نے اپنے اقارب عتبہ شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ نے جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے عرض کیا کہ یا رسول اللہ علیہ السلام اگر آپ علیہ السلام حکم دیں تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر خدمت میں حاضر کروں مگر آپ علیہ السلام نے منع فرما دیا۔

کفار سے دوسری بڑی جنگ احد کے میدان میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں بھی حضرت ابوعبیدہؓ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اسی غزوہ میں زرہ کی دو کڑیاں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں گھس گئیں جنہیں نکالنے کے لئے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ بالآخر حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے اپنے دانتوں کے زور سے کھینچ کر یہ دونوں کڑیاں آپ علیہ السلام کے جسم مبارک سے نکال لیں جس کے باعث آپؓ کے اگلے دو دانت بھی ٹوٹ گئے۔ مگر آپؓ کو اپنے ان دانتوں کے ٹوٹنے کا کوئی فکر نہ ہوا بلکہ خوشی ہوئی کہ یہ خدمت بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے لی ہے جسے بعد میں بھی آپؓ اس واقعہ کو فخر سے بیان فرماتے تھے۔ ویسے بھی یہ دانت کیا چیز ہیں جس مقدس صاحب نے اپنے حقیقی باپ کو اسلام کی سربلندی کے لئے تہ تیغ کر ڈالا۔ ان واقعات کو آج کا ترقی یافتہ انسان افسانہ قرار دیتا ہے، مگر یہ حقائق واقعات ہیں سچ ہے

ع مسلماں در گور و مسلمانی در کتاب

غزوۂ خندق میں بھی حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح موجود تھے۔ ایک جنگ "سریہ بنو ثعلبہ" حضرت نبی کریم علیہ السلام کی زندگی میں لڑی گئی تھی جس میں حضرت علیہ السلام نے حضرت ابوعبیدہؓ کو ہی سپہ سالار بنا کر بھیجا اور بھی کئی ایسے معرکے فتح کرنے کے لئے آپؓ کو بھیجا گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ کی افضلیت اور مقام اتنا بلند تھا کہ ایک بار حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ جیسے اولوالعزم بھی آپؓ کے ماتحت بھیجے گئے تھے طبیعت ایسی نرم تھی کہ ایک بار آنحضرت علیہ السلام نے آپؓ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا وہاں حضرت عمرو بن العاصؓ بھی بحیثیت امیر لشکر کے موجود تھے تو چند سوال و جواب کے بعد آپؓ نے حضرت عمروؓ بن عاص کی ماتحتی قبول فرمائی تھی۔ جب حضرت نبی کریم علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ابوعبیدہؓ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ ایک اور مہم میں آپؓ کی معیت میں تین سو مجاہدین دے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روانہ کیا تھا کھانے کے لئے صرف کھجوریں تھیں، مگر یہ کھجوریں بھی جلد ختم ہو گئیں تو اس وقت اس لشکر اسلام کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ منقول ہے کہ اسوقت جنگل کے پتے وغیرہ کھا کر مجاہدین گزارا کرتے تھے جس کے باعث صحابہ کرام مجاہدینؓ کے منہ میں چھالے پڑ گئے اور بڑی سخت تکلیف ہوئی یہانتک کہ پاخانہ کی بجائے اونٹ بکریوں کی طرح ان مقدس حضرات کو بھی مینگنیاں آنے لگیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک وزنی اور بھاری مچھلی دریا سے عطا فرمائی جسکو تین سو آدمیوں نے ایک مہینے تک کھایا بلکہ پھر وہ اس مچھلی کا گوشت مدینہ منورہ اپنے ساتھ لے گئے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تھوڑا سا گوشت کھایا۔ جب فتح مکہ کے لئے اسلام کا لشکر روانہ ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے اور غزوۂ طائف میں بھی۔ غرضیکہ اسلام کی نعمت حاصل کرنے کے بعد کوئی ایسا موقع نہیں جہاں حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ نہ ہوں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی ساتھ تھے۔ اہل نجران کے پاس بحیثیت مبلغ اسلام بنا کر بھی آپؓ کو حضرت نبی علیہ السلام نے بھیجا تھا۔ اور ایک بار جزیہ کی بہت بڑی رقم لانے کے لئے بھی اسی خوش قسمت انسان کا انتخاب ہوا تھا۔ یہ پروانۂ نبوت جب تک حضرت علیہ السلام دنیا میں رہے کوئی موقع اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا اور شدت اختیار کر گیا۔ انصار کہتے تھے کہ خلیفہ انصار سے ہو اور دیگر جمیع صحابہ کرامؓ قریش کو ترجیح دیتے تھے۔ اسوقت بھی حضرت ابوعبیدہؓ کی تقریر کے ایک جملہ نے کام بنا دیا۔ فرمایا:

"یامعاشرالانصار انکم کنتم اول من نصر فلاتکونوا اول من غیر۔ اے انصار کی جماعت تم ہی نے اول اول اسلام کی نصرت فرمائی۔ اب دیکھئے ایسے نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے اسلام اختلاف کا شکار ہو جائے۔

حضرت ابوعبیدہؓ کے اس جملہ نے اس شدید اختلاف کی آگ بجھا دی۔ فوراً ہی اسی مجلس سے ایک انصاری اٹھے اور فرمایا کہ واقعی حضرت ابوعبیدہؓ نے سچ ہی فرمایا ہے اس لئے ہم خلافت سے دستبردار ہوتے ہیں۔ خلافت قریش کا حق ہے۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو اس مجلس میں بیٹھے ہوئے جلیل القدر حضرت صدیقؓ نے فاروق اعظمؓ

کے مناقب بیان کرکے فرمایا کہ یہ خلافت کے لئے بہت ہی زیادہ موزوں ہیں اور یہ ابوعبیدہؓ الجراح جنکو نبی علیہ السلام نے "امین الامت" کا عظیم لقب بخشا ہے۔ یہ بھی خلافت کے لئے موزوں ہیں۔ ان دونوں میں کسی کی بیعت کرلیجئے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کی عظمت و خلافت اسلام اور بڑی فضیلت کے باعث آپؓ کو ہی خلیفۃ الرسول منتخب کرنے کے لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا اور پھر خود ہی جلدی کرکے فرمایا کہ بڑھائیے ہاتھ بیعت کے لئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح بھی بڑھے تاکہ سب سے پہلے وہی بیعت کریں مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے سبقت کرلی۔ دوسری بیعت حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمائی۔ خلافت صدیقیؓ میں ارتداد کا فتنہ پھیلا۔ آپؓ نے بڑی جوانمردی کے ساتھ اس فتنہ کا قلع قمع فرمایا۔ اس باب میں حضرت خالدؓ سیف اللہ کی خدمات کا تذکرہ ہم انشاءاللہ اگلی ملاقات میں کریں گے۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ الرسول نے شہنشاہ ایران اور قیصر روم کی طرف توجہ فرمائی۔ تقریباً یہ ۱۳ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس بڑی مہم کو فتح کرنے کے لئے اس طرح تقسیم فرمایا کہ عمروؓ بن العاص کو فلسطین کی طرف حضرت شرجیلؓ کو اردن کی طرف حضرت یزید بن ابی سفیان یعنی حضرت امیر معاویہؓ کے بڑے بھائی کو دمشق کی طرف اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو حمص کی طرف اسلامی فوجیں دے کر روانہ فرمایا اور یہ بھی آپنے سرکاری علم میں لکھ دیا کہ اگر یہ سب فوجیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر ایسی صورت میں ان سب کا سپہ سالار اعظم حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح ہی ہوں گے۔ اس واقعہ سے بھی آپؓ کے عظیم مرتبہ کا علم ہوتا ہے۔ جب حضرت ابوعبیدہ امین الامت اپنے مشن کی تکمیل کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے آپؓ کو کئی باتیں سمجھائیں جو بہت طویل ہیں۔ اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ:

"ابوعبیدہؓ میں نے خوب اچھی طرح دیکھا ہے کہ حضرت رسول کریم علیہ السلام تمہیں کس عزت اور محبت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور ان کے حضور میں تمہاری کتنی قدر و منزلت تھی۔ اسی وجہ سے میری نگاہ میں تمہاری بڑی وقعت ہے۔ میں خدائے عزوجل کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ آج تمام روئے زمین پر میں کسی شخص کو بھی تمہارے اور عمر بن الخطاب کے برابر نہیں سمجھتا ہر اس انسان کی عزت جو مجھ سے ملتا ہے میری نظر میں تمہاری وقعت سے کم ہے۔ جاؤ اللہ تعالے تمہارا حافظ و ناصر ہو"

(بحوالہ دس بڑے مسلمان)

حضرت صدیق اکبرؓ سے رخصت ہوتے ہی عمان کے ایک شہر "مآب" پہنچے۔ کفار نے مقابلہ کیا مگر بہت ہی جلد اس شہر کو مسلمانوں نے فتح کرلیا۔ کفار نے جزیہ دینا قبول کرلیا۔ یہ ہے شام کا سب سے پہلا شہر جہاں مسلمانوں نے اپنے اڈے قائم کرکے آگے کے لئے پروگراموں کو ترتیب دیا۔ دوسری جنگ جابیہ میں لڑی گئی۔ یہاں قیصر نے کافی مقدار میں فوج جمع کر رکھی تھی۔ چونکہ یہاں صورتحال بھی کافی مختلف تھی اس لئے مرکز اسلام مدینہ منورہ میں خلیفۃ الرسول کو اس سے آگاہ کیا گیا۔ اس لئے خالدؓ بن ولید کی زیر قیادت ایک اور لشکر بھیجا اور بڑی قوت کے ساتھ لڑائی شروع ہوگئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت فاروق اعظم خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے تو فاروق اعظمؓ نے حضرت خالدؓ سیف اللہ کو اس لئے معزول کر دیا تاکہ کفار کو یہ شبہ نہ رہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات حضرت خالدؓ بن ولید کی حربی قابلیت اور فنون جنگ کی مہارت کے باعث ہو رہی ہیں۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی کے بعد حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو لشکر اسلام کا سپہ سالار اعظم مقرر کر دیا گیا۔ اب چونکہ کفار کے حوصلے بالکل پست ہو گئے تھے اور وہ جنگ کسی بھی صورت میں نہ چاہتے تھے اس لئے اپنے ایک آدمی کو جنگ بندی کے لئے بھیجا۔ یہاں پہنچ کر یہ رومی حاکم حیران رہ گیا کہ سپہ سالار لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نہایت ہی معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ مسلمان ہم سے کچھ درہم دینار لے کر واپس ہو جائیں، مگر آپؓ نے وہی فرمایا کہ

اسلموا تسلموا' اسلام قبول کرو، جزیہ دو یا پھر تلوار سے مقابلہ کرو تاکہ رب غفور حق و باطل کا فیصلہ خود فرما دے۔

آخر لڑائی ہوئی۔ ان کی فوج کی تعداد پچاس ہزار تھی مگر ان کو شکست فاش ہوئی اور اب وہ تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا تھا تو لاذقہ فتح کرنے کے لئے فوج کو حرکت دی گئی اور وہ بھی فتح ہوگیا تو اب قیصر نے بہت بڑی تعداد میں فوج جمع کرلی مسلمانوں نے بھی اپنی اپنی تدابیر میں لڑائیں کہ کس طرح اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ رومی بھی دل سے جنگ نہیں چاہتے تھے۔ اس کو رکوانے کے لئے جب رومیوں کا قاصد آیا تو مسلمان مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز میں مسلمانوں کی محویت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ یہ کیسا عجیب و غریب نظارہ ہے اور دل میں مسلمانوں کی اس عبادت کا بہترین اثر اس کے دل و دماغ میں بیٹھا۔ اس نے حضرت ابوعبیدہؓ سے چند سوالات کئے اور مسلمان ہوگیا۔ آخر یہ جنگ لڑی گئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت تیس ہزار تھی اور رومیوں کی چار لاکھ کے قریب۔ اس کے باوجود بھی مسلمان مطمئن تھے اور رومی لرزاں ترساں تھے کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابو سفیانؓ اور آپؓ کی زوجہ ہندہؓ نے جو قابل قدر کارنامے انجام دیئے' دل سے بے ساختہ انؓ کے لئے دعائیں نکلتی ہیں حتیٰ کہ حضرت عکرمہؓ جو بہت بڑا دشمن اسلام مشہور تھا اب مسلمان ہو جانے کے بعد ایسی بہادری سے لڑا کہ اسی جنگ ہی میں شہید ہو گیا۔ نہایت ہی خوفناک اور ہولناک جنگ کے بعد آخر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ بقول مؤرخ طبریؒ رومی ایک لاکھ سے بھی ہلاک ہوئے جبکہ مسلمان تین ہزار شہید ہوئے اور قیصر روم بھی قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ پھر یرموک یرموک کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ بیت المقدس پہنچے۔ ان لوگوں نے چند سوالات کے بعد کہا کہ اگر تمہارا خلیفہ آ جائے تو ہم ہتھیار ڈال دیں گے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ سب کچھ لکھ کر مدینہ منورہ میں خلیفۃ المسلمین کو آگاہ کیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ تشریف لائے۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ ابو عبیدہ آج ہم تیرے مہمان ہیں۔ ابو عبیدہؓ نے کئی دنوں کے خشک ٹکڑے پیش کئے تو امیرالمؤمنین رو دیئے اور فرمایا کہ اے ابا عبیدہؓ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے تم اسی طریقہ پر زندگی گزار رہے ہو۔ آخری معرکہ آرمینا کا لڑا گیا اس میں کفار کو ایسی شکست ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔

(نوٹ) ان واقعات سے اب ہم مسلمانوں کو بھی غور و فکر کرنا چاہیئے کہ لاکھوں کافروں کو شکست فاش دینے والوں کا آج کیا عالم ہے؟ یہ سب اسلام سے روگردانی اور عدم اتحادی کا نتیجہ ہے۔ اگر مسلمانوں کا ایک بلاک ایک نظام اسلام ایک ہی سکہ اور مشترکہ فوج ہو تو کفار ان حربی سامانوں کے باوجود بھی ایسے مسلمانوں کے سایہ سے بھاگیں گے جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو آمین ثم آمین۔

وفات

اس علاقہ میں طاعون پھیلا تو حضرت امیرالمؤمنین نے ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ مدینہ چلے آؤ ضروری کام ہے۔ مگر آپؓ نے جواباً لکھا کہ اسلامی لشکر کو چھوڑ کر میں وہاں نہیں آ سکتا۔ حقیقتاً حضرت امیرالمؤمنینؓ اس علاقے سے حضرت ابو عبیدہؓ کو نکالنا چاہتے تھے۔ آپؓ انؓ کا مقصد سمجھ گئے اس لئے عذر کر دیا۔ جابیہ پہنچتے ہی آپؓ بیمار پڑ گئے طاعون کی گلٹی بھی ظاہر ہو گئی۔ جب بظاہر بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ وہ وقت نماز کا تھا۔ ادھر حضرت معاذؓ نے نماز ختم کی ادھر دنیا سے حضرت ابو عبیدہؓ سفر تمام کر کے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے رہے نام اللہ کا

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپؓ حضرت ابو عبیدہؓ کی نعش کو مخاطب کر کے پہلے آپؓ کے مناقب بیان کرتے رہے پھر جنازہ کے بعد فرمایا:

"مسلمانو آج تم سے ایسا شخص جدا ہو گیا ہے جس کے سب مانند میں نے کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔ وہ تم سب سے زیادہ نمود و نمائش سے بری تھے۔ سادگی اور قناعت انکا زیور تھا وہ مسلمانوں کے انتہائی خیرخواہ تھے، وہ خلق اللہ سے بڑی شفقت سے پیش آیا کرتے تھے پس تم ان کے لئے زیادہ سے زیادہ رحمت کی دعا مانگو۔ آئندہ کوئی شخص ان کی مانند تمہارا امیر اور سپہ سالار نہیں ہو گا۔"

پھر بیت المقدس اور دمشق کے درمیان ایک مقام پر آپؓ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

جب حضرت امیرالمؤمنین فاروق اعظمؓ کو حضرت ابو عبیدہؓ کی وفات کا علم ہوا تو آپ بہت زیادہ روئے۔ منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو حضرت نبی کریم علیہ السلام اور حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے صدمہ کے بعد سب سے زیادہ صدمہ ابو عبیدہؓ بن الجراح کا ہوا۔ آپؓ اگرچہ سپہ سالار اعظم تھے مگر ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی سے بھی ایسی محبت اور خاکساری سے پیش آتے تھے جیسے کسی بڑے سے بڑے افسر اور حاکم کے ساتھ بڑے صاحب کمال تھے۔ "دس بڑے مسلمان" کے مصنف لکھتے ہیں کہ زہد و قناعت اور اتقاء پرہیزگاری کا گویا ایک مجسمہ تھے۔ خدا کا خوف دل میں اس قدر جاگزیں تھا کہ معمولی معمولی باتوں سے بھی عبرت اور نصیحت حاصل کرتے تھے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور جلال سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔ بغض اور کینہ' عداوت اور رنجش کبھی کسی سے نہ رکھتے۔ ان کا دل آئینہ کی مانند ہر شخص کی طرف سے صاف رہتا تھا۔ اپنا قصور دیکھتے تو بلا تأمل اپنے چھوٹوں سے بھی معافی مانگ لیتے خلقت کی خیرخواہی اور ابنائے جنس کی ہمدردی میں ہمیشہ ساعی رہتے۔ نیکی حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اپنوں کے ساتھ جتنے نرم مزاج تھے کفار اور مشرکین کے مقابلہ میں اتنے ہی سخت تھے۔ ساری عمر کسی کا دباؤ اور رعب نہیں مانا۔ نہایت عالی حوصلہ اور سیر چشم تھے۔ حق و انصاف کے مقابلے میں نقصان کی کبھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ خود خلفاء کے دلوں میں بھی آپؓ کی بے حد عزت اور وقعت تھی۔ چنانچہ ایک بار حضرت صدیق اکبرؓ نے آپؓ کی امداد کے لئے عرب کے ایک بہادر شخص کو کچھ فوج دے کر روانہ کیا تو اس کو فرمایا کہ میاں تم کو ابو عبیدہ امین الامت (باقی صفحہ ۲۶ پر)

ملاقات: راؤ منوّر احمد خاں

ستّر لاکھ آبادی کے شہر کراچی میں پینے کے پانی کا مسئلہ حکومت کی فوری توجّہ کا مستحق ہے

کچّی آبادیوں کے سترہ لاکھ مکینوں کو جلد مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔

معروف نوجوان سماجی راہنما مولانا عبدُ الرّزاق سے ایک ملاقات

بڑے لوگوں کے بیانات اور انٹرویو آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ آج خیال گذرا کہ کیوں نہ کسی ایسی شخصیت سے گفتگو ہو جس کی بلندی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کی مرہونِ منّت نہ ہو، جس کی شہرت کو پروپگنڈہ اور تعریف و توصیف کے پَر نہ لگے ہوں، جسے نہ ستائش کی تمنا ہو نہ صلے کی پروا۔ ہماری یہ شرائط دل ناداں نے سُنی تو قرعہ کراچی کے نوجوان سماجی رہنما مولانا عبدالرزاق عزیز کے نام نکل آیا۔ مولانا سے ملاقات ہوئی تو احساس ہُوا کہ یقیناً یہ وہی ہیں جنہیں دیکھ کر شاعر نے تمنا کی تھی ؎

جوانوں کو پیروں کا استاد کر

موصوف ۱۹۵۲ء میں ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مختلف تعلیمی درسگاہوں میں حاصل کی اور کچھ عرصہ جامعۃ العلوم بنوری ٹاؤن کراچی میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور سندِ فراغت پنجاب کی معروف تعلیم گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے حاصل کی۔ آپ ایک عرصہ سے کراچی میں مذہبی۔ سماجی۔ سیاسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ۔ ملک کی سلامتی اور عوامی مفاد کی خاطر اٹھنے والی ہر تحریک میں اس نوجوان کا حصّہ ہے۔ موصوف نے ابھی عمر کی صرف ٹھائیس بہاریں دیکھی ہیں لیکن جس رفتار سے عوام میں اعتماد حاصل کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ مستقبل میں کوئی اہم کردار ادا کریں گے۔ کراچی جیسے عظیم شہر میں انکا اسقدر جلد متعارف ہونا ان کی استعداد صلاحیت اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ کراچی میں جماعت کو متعارف کرانے میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اس کا سبھی اعتراف کرتے ہیں۔ مولانا سے جس مجلس میں کراچی کے مسائل پر گفتگو ہوئی اسی محفل میں جناب عمران شاہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ شاہ صاحب یہاں کی قابلِ احترام شخصیت ہیں اور کراچی کے مسائل پر انہوں نے جو گفتگو فرمائی اس سے محسوس ہوا کہ وہ کراچی کے مسائل اور ان کے حل کا کتنا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق نے میرے پہلے سوال کے جواب میں فرمایا کراچی کی آبادی اسوقت ستّر لاکھ کے قریب ہے اور اس شہر کے اتنے مسائل ہیں شاید ہی کسی اور جگہ کے اتنے ہوں۔ کراچی سے باہر کے لوگوں کے ذہن میں صرف یہ تاثر ہے کہ کراچی کے عوام کے کوئی مسائل نہیں، وہاں کے تمام لوگ خوشحال ہیں، دنیا کی ہر نعمت ان کو میسّر ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہاں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جن کے پاس بے شمار دولت کے انبار ہیں، لیکن دوسری طرف ایسے لوگ بھی اسی کراچی میں مقیم ہیں جن کو دو وقت کا کھانا بھی صحیح طور پر میسّر نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ بنگلے ہیں، کاریں ہیں، سونے اور بیٹھنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے قالین ہیں! اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے پاس سر ڈھانپنے کے لئے دو گز کپڑا نہیں۔ بہرحال اسوقت میں آپ کے مؤقر جریدے کی وساطت سے حکومت کی توجّہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو یہاں کا سب سے اہم اور سب کا متفقہ مسئلہ ہے وہ ہے:

"پینے کے پانی کا مسئلہ"

اب یہ ہر انسان کی ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان گذارا نہیں کر سکتا۔ کراچی کا چونکہ اپنا پانی خراب ہے اس لئے پانی حیدرآباد اور دوسرے مقامات سے آتا ہے لیکن آب رسانی کا نظام اسقدر غلط ہے کہ یہاں کی کئی کالونیوں کے عوام پانی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس طرف آج تک صحیح منصوبہ بندی کے ذریعہ کوئی خاص کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی اور جو انتظام اس کے حل کے لئے کئے گئے ہیں وہ بالکل ناکافی ہیں خصوصاً گرمیوں میں یہ نظام اور بھی [illegible] ہو جاتا ہے اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں پانی

بالکل نہیں پہنچتا اور عوام کو سخت دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گھنٹہ پانی آتا ہے اور عوام قطار اندر قطار پانی کے حصول میں بے تاب کھڑے ہوتے ہیں لیکن پانی بند ہو جانے کی وجہ سے پھر مایوس لوٹتے ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کریں کہ ایسے میں ان کی حالت کیا ہوگی۔ اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ تمام رات کی نیند گنوا کر پانی کے انتظار میں لوگ کھڑے رہتے ہیں لیکن ایک دو گھنٹے پانی آنے کے بعد پھر بند ہو جاتا ہے۔ اندازہ کریں اتنی دیر میں کیا تمام لوگ پانی لے سکتے ہیں جو تمام رات پانی لینے کے انتظار میں کھڑے رہے۔ گرمیوں میں تو یہاں پانی کے حصول میں اتنی پریشانی ہوتی ہے کہ عوام تنگ آکر خود آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ پانی کے حصول کے مسئلہ میں یہاں قتل تک ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیں ان واقعات کی ذمہ داری کس پر ہے۔

لیکن یہاں پر ہی کچھ مقامات ایسے ہیں جنکو اس مشکل کا سامنا نہیں، خصوصاً سوسائٹی کے علاقہ میں عوام کو ہر چیز کی سہولت حاصل ہے لیکن وہاں غریب تو درکنار متوسط درجہ کا آدمی بھی کب رہ سکتا ہے۔

اس لئے میں حکومت سے درخواست کروں گا کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس مسئلہ کا حل تلاش کرے، اور جو اقدامات اس سلسلہ میں اٹھائے جا رہے ہیں ان کو تیز تر کر دیا جائے۔

کراچی میں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں سے میٹھا پانی نکلنا شروع ہوا ہے، ان سے بھی عوام کو فائدہ پہنچانے کے انتظامات کیے جائیں۔ آج کا یہ ماڈرن شہر جسے عروس البلاد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، حکومت کی بڑی توجہ کا مستحق ہے۔ اگر اس طرف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو یہاں کے عوام پینے کے پانی سے محروم ہو جائیں گے۔

پانی کے نکاس کا مسئلہ

ایسا ہی ایک مسئلہ گندے پانی کے نکاس کا ہے۔ گندے پانی کو نکالنے کے لئے کوئی انتظام نہیں۔ یہاں ایک گھنٹہ بھی بارش ہو جائے تو شہریوں کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پانی کے نکاس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے گندا پانی مکانوں میں داخل ہو جاتا ہے جس سے عوام کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔

ٹرانسپورٹ

کراچی کی جتنی آبادی ہے اسکی مناسبت سے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ملازمین طبقہ جب صبح کو دفاتر میں جانے کے لئے گھروں سے نکلتا ہے تو اس کو کئی کئی گھنٹے انتظار کے بعد کسی بس میں جگہ ملتی ہے۔ اور اس طرح چھوٹے ملازمین جن کے پاس اپنی سواری کا انتظام نہیں وقت پر دفتر نہیں پہنچتے۔ ٹرانسپورٹ کم ہونے کی وجہ سے اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ عام انسان ان میں سوار نہیں ہو سکتا، لہذا حکومت کو چاہیئے کہ یہاں بسوں کی تعداد میں مزید اضافہ کیا جائے تاکہ عوام اس تکلیف سے نجات حاصل کر سکیں۔ کراچی میں اکثر و بیشتر روڈ انتہائی خستہ حالت میں ہیں ان کو فوری مرمت کیا جائے۔

تمام رات لوگ پانی کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔

تعلیمی ادارے

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہاں تعلیمی اداروں کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ اکثر اسکولوں میں لڑکوں کے پاس بیٹھنے کے لئے دریاں تک نہیں اور ان کو نیچے بیٹھنا پڑتا ہے اور ان میں سے کافی اسکول ایسے ہیں جن کے فرش تک کچے ہیں اندازہ کریں ایسے ماحول میں طلباء کیا تعلیم حاصل کریں گے اور سکولوں میں کوئی معیار تعلیم بھی نہیں۔ اساتذہ صرف تنخواہ کی خاطر سکول میں آجاتے ہیں، بچوں کے مستقبل سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ جس وقت تک سکول قومی تحویل میں نہیں لئے گئے تھے وہاں تعلیم کافی بہتر تھی اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا تعلیمی معیار بہت بہتر تھا۔ اساتذہ محنت کراتے تھے اور طلباء کی بھی مناسب دیکھ بھال کی جاتی تھی؛ لیکن جب سے یہ ادارے نیشنلائز ہوئے ہیں انکا معیار بھی پست ہوتا چلا گیا اور آج یہاں بھی تعلیم کا معیار ایک معمہ بن گیا ہے۔ اور پھر یہ ظلم بھی تعلیمی اداروں میں ہو رہا ہے کہ وہاں پر جو اساتذہ تعلیم دیتے ہیں وہ نظریاتی طور پر اسلامی نظریہ کے خلاف ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں، کالجز، سکولز آج غیروں کی تقلید میں پیش پیش ہیں۔ دوسروں کے نظریہ کی تبلیغ انکا خاص مشن ہے۔ آپ دیکھیں جب اساتذہ ایسے ہوں گے تو طلباء کا کیا حال ہوگا۔ اور پھر ان مستقبل کے وارثوں کی تربیت ایسے ہی اساتذہ کے ہاتھوں ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے ان کے تربیت یافتہ طلباء کب اس ملک میں اسلامی نظام کے ہمنوا بن سکتے ہیں۔ اسی طرح یہاں میڈیکل کالجز کا مسئلہ ہے۔ طلباء کی تعداد زیادہ اور کالجز کم۔ میڈیکل کالج کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ طلباء کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو ختم کیا جائے۔

مزدوروں کے مسائل:-

مزدور اور محنت کش ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ سابقہ نام نہاد عوامی حکومت کے دور میں بھی ان کے مسائل حل کرنے کے لئے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ایک مزدور رات دن جس کارخانے میں کام کرتا ہے اس کی وہاں کوئی حیثیت نہیں۔ کارخانہ دار جب چاہے اسے بغیر کسی وجہ کے نکال سکتا ہے۔

آج تک اس کی حیثیت کا تعین نہیں ہوا اور ان کی ملازمت کو کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ آج کے اس دور میں جبکہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے ان کی تنخواہیں اسقدر کم ہیں کہ ان کا گذر اوقات بھی صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ اس لئے حکومت اس طرف فوری کارروائی کرے

کچی آبادیوں کے مکین

انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کراچی میں کچی آبادیوں کے مکین پچیس سال سے مقیم ہیں لیکن آج تک انکو مالکانہ حقوق نہیں دیے گئے۔ سابقہ حکومت نے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے کہا سابقہ حکومت کے ذمہ دار حضرات نے لیاری اور شیرشاہ کے متعلق کہا تھا کہ ہم اس علاقے کو پیرس بنائیں گے۔ افسوس کہ وہ اس علاقہ کو ایک اچھی کالونی میں بھی تبدیل نہ کر سکے۔ اسی طرح موجودہ حکومت نے بھی سترہ لاکھ کچی آبادیوں کے مکینوں کو مالکانہ حقوق نہیں دیے جبکہ ایک طویل عرصہ سے یہ لوگ یہاں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کراچی کے عوام کے ساتھ اتنی زیادتیاں ہو رہی ہیں کہ آج تک یہاں کے عوام کی ترقی کے لئے کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا۔ یہاں سے اتنے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں لیکن ترقی پر کوئی رقم خرچ نہیں کی جاتی۔ پورے سندھ میں جتنی بھی ترقیاتی سکیمیں بن رہی ہیں وہ کراچی کی آمدنی سے ہی بن رہی ہیں۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے یہاں کی کچی آبادیوں کے مکینوں کو فوری مالکانہ حقوق دے اور ان کی آمدنی کو کراچی کی ترقی کے لئے خرچ کرے۔

اسی طرح آج کل کراچی کا کاروباری طبقہ بہت پریشان ہے۔

اس لئے ان کے مسائل کی طرف فوری توجہ دینی چاہیئے۔

جرائم میں اضافہ

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے اس وقت کراچی میں دن دہاڑے ڈاکہ زنی ہو رہی ہے۔ قتل و غارت میں اضافہ ہے۔ ایک خاص گروہ دن میں ہی بینکوں کو لوٹ رہا ہے۔ کراچی میں ایک رات ایسا بھی ہوا ہے کہ بیس ۲۰ پیٹرول پمپ لوٹ لئے گئے ہیں۔ میں یہ کہوں گا کہ ان جرائم پیشہ افراد کے پیچھے کوئی ضرور بڑا ہاتھ ہے جس ہاتھ کو آج تک نہیں پکڑا گیا۔ نوکر شاہی یہاں من مانی کر رہی ہے، اور حکومت کی پالیسیوں کو اس طبقہ سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

کراچی میں اس دور میں جرائم میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ پوری تاریخ میں اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مارشل لاء انتظامیہ کی بھی ایسے لوگوں پر کوئی گرفت نہیں۔

بقیہ: اللہ والوں کی دنیا

کی ماتحتی میں بھیج رہا ہوں۔ وہ اس خوبی کے انسان ہیں کہ جب ان کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا ہے تو وہ ان سے نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ جو ان سے بدسلوکی کرتا ہے تو وہ ان سے نیک برتاؤ کرتے ہیں، جو ان کے ساتھ دشمنی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ دوستی کرتے ہیں۔ پس تم کسی صورت میں بھی ان کی نافرمانی نہ کرنا۔" (دس بڑے مسلمان)

علاوہ ازیں حضرت علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں حضرت عمرؓ کے حالات میں ص۲۱۵ پر لکھا ہے کہ مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ:

"اگر میں ابو عبیدہؓ بن الجراح کی زندگی میں انتقال کر دوں تو حضرت ابو عبیدہؓ کو خلیفہ مقرر کیا جائے اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے بارے میں سوال کرے گا تو میں عرض کروں گا کہ ہر امت میں ایک امین ہوتا ہے اور میرے امین ابو عبیدہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ"

خدا پر بھروسہ کرو

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو جیسا کہ اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہے' تو وہ تم کو اس طرح روزی دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح بھوکے پیٹ جاتے اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔

آخری نصیحت

حضرت حسنؓ کا جب انتقال ہونے لگا تو کچھ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ کوئی آخری نصیحت فرمایئے۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا: میں تین باتیں تم سے کہتا ہوں ان کو سن کر میرے پاس سے چلے جانا اور میں جہاں جا رہا ہوں مجھے وہاں تنہائی میں جانے دینا۔ اس کے بعد فرمایا جس کام کا دوسرے کو حکم کرو پہلے خود اس پر عمل شروع کر دو۔ جس بات سے دوسرے کو منع کرو پہلے خود اس سے رک جاؤ۔ تمہارا ہر قدم تمہارے لئے نافع ہے کہ جنت کی طرف بڑھتا ہے یا مضر ہے کہ جہنم کی طرف بڑھتا ہے۔ اس لئے ہر قدم کو اٹھاتے وقت یہ سوچ لو کہ کدھر کی طرف جا رہا ہے۔

مرسلہ محمد سرور گوجرانوالہ

ترتیب قادری بشیر احمد فقیر والی

دار العلوم دیوبند

مشاہیر کی نظر میں

علامہ سید رشید رضا (مصر)

"اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے بہت غمگین واپس جاتا۔" (تقریر)

"میں نے مدرسہ دیوبند میں جس کو ازہر ہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی رجحان ترقی کرتے دیکھا۔ ہندوستان بھر میں میری آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسۂ دیوبند میں حاصل ہوئی۔ اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہوئی جتنی وہاں۔ اس کی وجہ صرف وہ غیرت و اخلاص ہے جو میں نے اس مدرسہ کے علماء میں دیکھا۔"

آئینہ دار العلوم دیوبند ص۲
(بحوالہ رسالہ المنار مصر)

مولانا ابو الکلام آزاد

(وزیر تعلیم حکومت ہند)

۱۔ آپ کی یہ درسگاہ دراصل ایک ایسا کارخانہ ہے جو مسلمان کی روح کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اس درسگاہ کے اسلاف نے عمل کا جو نمونہ پیش کیا تھا اور جن مقاصد کو لے کر یہ درسگاہ قائم کی تھی، اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ شاندار مستقبل آپ کے لیے تیار ہے۔ (تقریر)

۲۔ ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ترین ادارہ میں نہ صرف یہ کہ اس ملک کے تمام حصوں سے بلکہ بعید ترین علاقوں مثلاً انڈونیشیا، ملایا، افغانستان وسط ایشیا اور چین سے طلباء کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے وسیع رقبہ کے طلباء اور علماء میں اس کی مقبولیت اس کی عظمت و شہرت کی دلیل ہے۔ اس بنا پر یہ ادارہ صحیح معنوں میں تعلیمات اسلامی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔ (معائنہ)

(آئینہ دار العلوم دیوبند ص۳)

اعلیٰ حضرت شاہِ افغانستان

"مجھے بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دار العلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دار العلوم افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علماء دار العلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور علم و روحانیت کے فیض سے جو فضیلت اور مرتبت انہیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علماء اس دار العلوم سے فیض یاب ہوئے اور انہوں نے اپنے وطن عزیز واپس جا کر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔"

آئینہ دار العلوم دیوبند ص۴

جناب انوار السادات

(وزیر حکومت مصر جنرل سیکرٹری موتمر اسلامی حال صدر جمہوریہ مصر)

"اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارکباد پیش کروں، جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منار ثابت ہو۔ (آئینہ دار العلوم دیوبند ص۴)

مسٹر عبد اللطیف

(وزیر عدل و صحت برما)

یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے صرف

میں ایک یونیورسٹی ہے۔ مجھے ہندوستان اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں کے بارے میں ذاتی تجربہ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کی بہت سی یونیورسٹیاں اس قدیم طرز کی یونیورسٹی سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔"

آئینۂ دارالعلوم دیوبند ص ۶

رئیس روسی وفد

برائے ہندوستان

"میں نے یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کو دلچسپی سے دیکھا۔ براعظم کے اس حصہ میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی دریادلی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امن اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے، ہندوستانی عوام اور سوویٹ یونین کے عوام کے درمیان ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔"

(آئینۂ دارالعلوم دیوبند ص ۶)

امریکی وفد برائے ہندوستان

"ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو نور بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) ضوفشاں ہے۔

آئینۂ دارالعلوم دیوبند ص ۶

جناب علی اصغر حکمت

(سفیر ایران برائے ہندوستان)

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبد ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نعمت سے نوازا، اور یہاں کے اساتذۂ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طیبات سے اس عبد ضعیف کے دل و جان بہرہ ور ہوئے ان کے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا۔"

آئینۂ دارالعلوم دیوبند ص ۶

مشہور مورخ "شیخ محمد اکرام"

کی نظر میں

مشہور مورخ و محقق جناب شیخ محمد اکرام دارالعلوم دیوبند کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"گذشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے وہاں سے ہزاروں علماء اور طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں، جنہوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے ہیں۔ مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی۔ یہ درست ہے کہ وہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں سے باخبر نہیں، لیکن ان میں تقویٰ، پرہیزگاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے، اور صرف اسی کا فیض ملک کے دور دراز حصوں میں پہنچانا ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور اور غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور انہیں اس پر فخر کا جائز حق ہے۔"

موج کوثر ص ۲۲۹ تا ص ۲۳۰

ایڈیٹر اخبار "عصر جدید"

کی نظر میں

آج سے ۴۴ سال قبل کلکتہ کے مشہور "عصر جدید" کے ایڈیٹر نے دارالعلوم دیوبند کی علمی اور مذہبی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے، ہندوستان کے طویل و عریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کر دیا تھا، جبکہ دنیاوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جبکہ لوگ مذہب سے بے پروا اور مذہبی تعلیم سے غافل ہو چکے تھے اور قال اللہ و قال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقارخانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے مغلوب ہو چکی تھی۔

اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا، جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا۔ ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھیوں نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا۔ فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو قدامت سے منحرف نہ کر سکی۔ نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں بہا کر لے جائے، مگر کسمپرسی کے باوجود ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قندھار، موصل بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصے سے فدائیان قرآن و حدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔"

عصر جدید کلکتہ

اپنے ہم مذہبوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے لائق انسان پیدا کئے۔"

جناب جی ابراہیم الجبالی

(رئیس وفد جامعہ ازہر مصر)

"ہمیں جامعہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسہ کے مدیر جناب شیخ شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی۔ ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پُر کر دیا، اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔ ہم نے ایک ایسی جماعت دیکھی جس نے علوم دینیہ یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی، ادب، منطق، فلسفہ اور الٰہیات وغیرہ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ان علوم سے امت اسلامیہ کو یہ حضرات نفع پہنچائیں۔"

آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۵

محمد عبدالفتاح عوزہ (مصر)

"میں نے دیوبند میں اسلام اور سنن و ایمان کا ایک قلعہ دیکھا اور محسوس کیا کہ دین کس طرح دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا ضامن ہوتا ہے، اور کس طرح سلف صالح کی تقلید جس کی حفاظت یہاں کے بزرگان دین کر رہے ہیں اور جس سے یہاں کے طلباء فیضیاب ہو رہے ہیں ایک بیش بہا میراث شمار کی جا سکتی ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس طریقہ کو مضبوطی سے پکڑیں اور مستقبل کی عمارتوں کے لئے اسے بنیاد بنائیں۔

(آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۴)

رشید احمد اسماعیل ٹکولیا

(جوہانسبرگ جنوبی افریقہ)

"انگریزی بولنے والی دنیا میں اس (دارالعلوم) کو ایٹن اور کیمبرج کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ درجہ اس کی شان کے لئے کمتر ہے۔ دارالعلوم کا مرتبہ دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسکا کوئی ہمسر نہیں۔"

آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۴

نیاز برکیز (ٹرکی)

لائبریری اور اس کے بیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا۔ میں اس عمدہ کام پر جو یہاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۴ تا ۵

ایس۔ ای۔ ملاں (جنوبی افریقہ)

"دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور ملاحظہ کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی سیاحت و سفر میں کسی جگہ ایسی عظیم الشان مذہبی درسگاہ نہیں دیکھی، جو اپنی نوعیت میں ایک مرکزی درسگاہ کہلانے کے قابل ہو۔ موجودہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

پروفیسر کریسونٹ

(آکسفورڈ یونیورسٹی لندن)

"یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دارالعلوم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر ابھی یہاں پوری آب و تاب سے درخشاں ہے۔ ایک مؤرخ کے لئے اس سے زیادہ روشن واقع کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۵

عثمان جی کیدو

(نائب صدر چینی اسلامک نیشنل فیڈریشن)

"میرے لئے یہ باعث سعادت ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خالص مذہبی ادارہ ہے جسے ازہر مشرق کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔"

(آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۵)

ڈی جولیس جرمینس

پروفیسر بوڈاپیسٹ یونیورسٹی ہنگری

"میں نے خود اپنے ملک میں دیوبند کے مدرسہ کے بارے میں سُنا۔ مجھے ہمیشہ سے شوق تھا کہ علوم اور اسلامک اسپرٹ (روح) کے اس قلعہ کو دیکھوں۔ ترکی اور مصر کے قدیم مدرسوں کے بعد جو مسجدوں میں قائم کئے جاتے ہیں۔ مجھے عربی اور اسلامی تعلیمات کی اس گہرائی اور جدوجہد کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوئی، جو اس مدرسہ کے درو دیوار میں دائر و سائر ہے۔

آئینہ دارالعلوم دیوبند ص ۵

ایم حسن

(وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

یہ (دارالعلوم دیوبند) صحیح معنی میں

مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء
بحوالہ تاریخ دیوبند

مشہور صحافی "سید حبیب"

ایڈیٹر "روزنامہ سیاست"

لکھتے ہیں۔

"جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین (دین) اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے دار العلوم دیوبند کے مدرسین و مبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں جس سے نمایاں طریقے پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے۔ اور دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دین حنیف علوم عربیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہٖ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔

سیاست لاہور

مورخہ ۲۷ جون ۱۹۲۳ء
بحوالہ تاریخ دیوبند ص۱۰

مولوی طفیل احمد منگلوری

مشہور محقق و مورخ طفیل احمد منگلوری دار العلوم دیوبند کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مدارس میں زیادہ نمایاں دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور ہیں۔ ان میں سے اول الذکر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اور ثانی الذکر کو مولوی محمد مظہر نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا۔ اول تو بالعموم تمام عربی مدارس حکومت کی نظروں میں مشتبہ تھے مگر دیوبند کی طرف نظر عتاب بالخصوص اس وجہ سے تھی کہ اس کے ہمدردوں میں متعدد اصحاب وہ تھے جن کی نسبت حکام وقت کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا اور وہ مسلمانوں کا مذہبی جوش قائم رکھنے کے لئے یہ مدرسہ قائم کر رہے تھے۔ مدرسہ کے بانیوں میں سے کئی علماء ایسے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تحصیل تھانہ بھون ضلع مظفر نگر پر قبضہ کر لیا تھا، جسے انگریزوں کی فوج نے واپس لے لیا تھا۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ ان مدارس نے نہ کبھی سرکاری امداد لینی گوارا کی اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے یہاں آنے کا موقع دیا، جو انہیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے، بلکہ شرع محمدیؐ کی تعلیم کو مقدم رکھا، جس کو حکام وقت ناگواری کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بالخصوص مدرسہ دیوبند کے بانی تو نہ صرف حکومت بلکہ امراء کے تعلقات سے بھی احتراز کرتے تھے۔

مسلمانوں کا روشن مستقبل

ص۱۸۷ تا ص۱۸۸

علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ کے دار العلوم دیوبند کے بارے میں تاثرات ملاحظہ فرمائیے:

"دیوبند ایک ضرورت تھی، اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل، وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم رہے۔"

اقبال کے حضور ص۲۹۳

"میری رائے ہے کہ دیوبند اور ندوہ کے لوگوں کی عربی علمیت ہماری دوسری یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اقبال نامہ حصہ دوم ص۲۲۳

افغان طلبہ نے "اتحاد طلبہ افغانستان" کے نام سے تنظیم قائم کر لی۔

ملک کے مختلف مدارس میں تعلیم پانے والے افغان طلبہ کا ایک نمائندہ اجلاس گذشتہ روز مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں مولانا قاضی حمید اللہ کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں روسی جارحیت کے خلاف افغانستان کی جنگ آزادی میں منظم کردار ادا کرنے کے لئے "اتحاد طلبہ افغانستان" کے نام سے افغان طلبہ کی ایک تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے جدوجہد کا عزم کیا گیا۔

۱۔ افغانستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے تمام گروپوں کے درمیان ارتباط و اتحاد کی سعی کرنا۔

۲۔ افغان طلبہ کو جہاد آزادی کے لئے منظم اور تیار کرنا۔

۳۔ افغانستان کے جہاد آزادی میں عالمی رائے عامہ بالخصوص دنیائے اسلام سے حمایت اور امداد حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

اجلاس میں مولانا عبد الغفور کی سربراہی میں ایک مرکزی تنظیمی کمیٹی قائم کی گئی جو ہر سطح پر "اتحاد طلبہ افغانستان" کی تشکیل و تنظیم کا پروگرام طے کرے گی اور اتحاد کا منشور اور نظام العمل وضع کرے گی۔ کمیٹی کے باقی ارکان یہ ہیں۔

مولوی عبد القدوس، مولوی عبد الوہاب، مولوی نصر اللہ، مولوی گل محمد، عبد الرحیم، عبد الظاہر، دوست محمد، محمد یعقوب، محمد اکبر صدیقی، عبد القیوم۔

انجمن پاک افغان دوستی کے سربراہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی خصوصی دعوت پر اجلاس میں شرکت کی اور اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے طلبہ کو یقین دلایا کہ پاکستان کے علماء، طلبہ اور عوام افغان بھائیوں کی جنگ آزادی میں ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف افغانستان کا نہیں بلکہ پورے دنیائے اسلام اور تمام ترقی پذیر ممالک کا ہے۔ کیونکہ اگر روسی جارحیت کا سدباب نہ کیا گیا تو عالم اسلام اور ترقی پذیر ممالک کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔

حافظ محمد لطیف سلیمی
اسلام آباد

دفتری اوقات

اور ہفتہ وار چھٹوں کا مسئلہ

حکومت کی طرف سے حالیہ نافذ کردہ دفتری اوقات نے ملازمین میں شدید اضطراب اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اخبارات اور رسائل میں اس پر لوگوں کا ردّ عمل اور اظہارِ خیال بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

نئے اوقات کار کے لئے حکومت کی طرف سے غالباً استدلال پیش کیا جا رہا ہے کہ صبح ساڑھے سات بجے دفاتر میں پہنچنا ملازمین کے لئے نہایت دشواری کا باعث تھا جس سے ایک طرف ضیاعِ وقت ہوتا تھا تو دوسری طرف دفاتر کی کارکردگی بُری طرح متاثر ہوتی تھی۔ اتنی سویرے دفتروں میں پہنچنے کے کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے جاگنا پڑتا تھا، سردیوں میں اتنی صبح بہت زیادہ سردی ہوتی ہے۔ راقم کے خیال میں یہ استدلال زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتا۔ دفاتر میں دیر سے پہنچنا دشواری سے زیادہ عادت اور مرض کا مسئلہ ہے۔ اصل میں پابندیٔ اوقات کے سلسلہ میں اسلام نے جس قدر زور دیا ہے مسلمان قوموں نے اسی قدر اس سے بے اعتنائی برتی ہے۔ قانونِ فطرت تو کسی لحاظ کے بغیر اس کائنات میں کارفرما ہے۔ کارزارِ حیات میں خواہ مسلمان ہو یا کافر جو شخص جتنی محنت کرے گا اتنا ہی پھل پائے گا، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

لیس للانسان الا ما سعیٰ

لہٰذا جن قوموں نے وقت کی قدر کی زمانے نے ان کی قدر کی؛ اور جن افراد نے وقت ایسی بے بہا نعمتِ عظمیٰ کو ضائع کیا زمانے نے ان کو پیچھے چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہ امر واقع ہے کہ جن اقوام نے پابندیٔ اوقات کو شعارِ حیات بنایا ہے وہ ترقی کی منازل کو نہایت تیزی سے طے کرتے ہوئے بامِ عروج کو پہنچ چکی ہیں؛ لیکن جن اقوام نے اس سے غفلت برتی وہ مادی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ ہمارے ہاں دفاتر میں دیر سے آنے کی وجہ مجبوری کے بجائے عادت اور غفلت ہے۔ دیر اور عدم پابندیٔ اوقات کے عادی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا بگڑ کیا جاتا ہے۔ جب سارے معاشرے میں الا ماشاء اللہ سب ہی لوگ پابندیٔ اوقات کی پروا نہیں کرتے تو وہ کیوں کریں۔ چنانچہ جو لوگ عدم پابندیٔ اوقات کے روگی ہوتے ہیں ان کے لئے ساڑھے سات کا وقت ہو یا نو بجے وہ ہمیشہ ہی دیر سے دفتر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ پہلے دیر سے آنے والے اب بھی حسبِ معمول دفتر لگنے کے بعد ہی دفتر پہنچتے ہیں، لہٰذا حکومت نے ساڑھے سات بجے سے ۹ بجے وقت بدل کر دیر سے آنے والوں کا علاج نہیں کیا بلکہ تمام ملازمین کے لئے خاصی مشکلات پیدا کر دیں۔ دفتری اوقات نو بجے سے شام چار بجے تک ان ممالک میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں ملازمین کی تنخواہیں کافی حد تک معقول ہوں، تاکہ ان کو نانِ جویں کا اہتمام کرنے کے لئے سائڈ بزنس وغیرہ کا سہارا نہ لینا پڑے۔ چنانچہ پہلے اڑھائی بجے کے بعد نچلے درجے کے ملازمین اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے کوئی نہ کوئی دھندہ یا کاروبار کر لیتے تھے! دھر ساڑھے سات بجے سے لے کر نو بجے تک صبح کا وقت کسی کام میں بمشکل ہی لگایا جا سکتا ہے بلکہ پہلے ساڑھے سات بجے دفتر کی تیاری کے لئے فجر کی نماز کے لئے اٹھ جاتے تھے! جبکہ اب اکثر لوگوں سے سنا گیا ہے کہ وہ نو بجے تیار ہونے کے لئے طلوعِ فجر کے بعد ہی جاگتے ہیں۔ اب سائڈ بزنس کرنے والے ملازمین سخت مشکلات سے دوچار ہیں۔

چونکہ دفاتر آنے جانے کے لئے کم از کم آدھ گھنٹہ پہلے اور آدھا گھنٹہ بلکہ ایک گھنٹہ تک وقت صرف ہوتا ہے؛ اس طرح ملازمین کے اکثر نجی کام چھٹی تک مؤخر رہتے ہیں۔ چنانچہ بیشتر کام چھٹی کے روز انجام پذیر ہوتے ہیں۔ چھٹی کا اصل مقصد تو ملازمین کو ہفتہ بھر کی تھکان سے آرام پا کر تازہ دم ہونے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ہفتہ بھر کے نجی اور گھریلو امور کی انجام دہی میں عام مشاہدہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ چھٹی کے روز دفتری

اوقات سے بھی زیادہ معروفیت سے گزارنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ چھٹی کے روز باہم میل ملاقات اور سماجی تقاریب، بیاہ شادیوں، عیادت و تعزیت وغیرہ ایسے معاملات بھی نپٹائے جاتے ہیں۔ نتیجتاً ایک چھٹی کا دن آرام کے بجائے زیادہ تھکاوٹ اور مشقت کا دن بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے اہلکاران کی استعداد کار روز بروز انحطاط ہو رہی ہے۔ اس مشکل سے نپٹنے کے لئے ملازمین کو نجی کام بھی دفتری اوقات کے دوران مختصر رخصت لے کر انجام دینے پڑتے ہیں۔ اس سے کارکردگی پر یقیناً برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ دفاتر میں اکثر یہ شکایات پائی جاتی ہیں کہ اہلکار اپنی اپنی سیٹوں پر نہیں ملتے بلکہ اپنے اپنے نجی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

اس مسئلہ پر شاید ہی دو رائیں ہوں کہ انسان خواہ کتنا ہی سخت جان ہو اس کی استعداد مسلسل محنت اور جانفشانی سے کم ہو جاتی ہے جس کی بحالی کے لئے اسے آرام اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہفتہ وار چھٹی کا فلسفہ یہی ہے۔ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طویل اوقات کار میں صلاحیت کار کم ہوتی ہے اور مختصر اوقات کار میں زیادہ۔ اسی وقت تقریباً دنیا کے بیشتر ممالک میں ہفتہ میں اڑتیس گھنٹے سے لے کر بیالیس گھنٹے تک ملازمین سے کام لیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جن ممالک میں ہفتہ وار دو تعطیل ہوتی ہیں وہاں کے ملازمین کی صلاحیت کار زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ اور جن ممالک میں اوقات کار طویل اور ہفتہ وار ایک چھٹی ہوتی ہے وہاں کی استعداد کار بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت مغربی ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک کے ملازمین کی صلاحیتوں میں تفاوت ہے۔ ہمارے ہم وطن گواہ ہیں کہ مغربی ممالک کے دفاتر میں جو کام چند گھنٹوں میں انجام پذیر ہوتا ہے اسی نوعیت کا کام کروانے کے لئے اپنے ملک کے اداروں میں کئی کئی روز بلکہ ہفتوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی رشوت اور سفارش کے ساتھ۔ اگر کسی ملازم کو ان کے سہل پسندانہ رویہ اور سست روی کا گلہ کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ گورنمنٹ ہمیں جیسا معاوضہ دیتی ہے ویسا ہی ہم کام کر سکتے ہیں! اور یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ہمارے اپنے ملک کے جن پرائیویٹ اداروں میں مشاہرے اور شرائط ملازمت سرکاری اداروں کی نسبت بہتر ہیں ان کے ملازمین سرکاری افسران سے زیادہ مستعد اور فعال ہوتے ہیں۔ مثلاً پی۔ آئی۔ اے، بنک، بیمہ کمپنیاں، ٹی۔ وی ریڈیو کارپوریشنیں وغیرہ۔

چھٹی کے اسی فلسفہ کی بنا پر اب بعض مغربی ممالک میں ہفتہ وار تین چھٹیاں رائج کرنے کے بارے میں بھی سوچا جا رہا ہے لیکن اگر تین چھٹیاں زیادہ بھی ہوں تو دو چھٹیاں تو بہر حال ترقی یافتہ ممالک تو در کنار مشرق اوسط اور ترقی پذیر ممالک میں رائج کر دی گئی ہیں۔

دو چھٹیاں ملازمین کی صلاحیت کار کو بہتر بنانے میں اس طرح ممد ثابت ہوتی ہیں کہ پہلے روز لوگ اپنے نجی امور انجام دے لیتے ہیں۔ دوسری چھٹی کے روز تفریح اور آرام کرتے ہیں۔ چنانچہ دو چھٹیوں کے بعد جب ایسے لوگ دفاتر میں جاتے ہیں تو جہاں ایک دن کی تفریح و آرام کے بعد وہ جسمانی اور ذہنی طور پر چاق و چوبند اور تازہ دم ہوتے ہیں دوسری طرف ان کو نجی کاموں کو نپٹانے کے لئے مختصر چھٹیاں لینے کی ضرورت نہ ہونے سے نجات مل جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے دفتری امور زیادہ دلجمعی سے انجام دیتے ہیں چونکہ ان کے ذہنوں پر نجی کام سوار نہیں ہوتے۔

پاکستان کو بھی ترقی یافتہ ممالک کے اسی مجرب نسخہ کو دفتری صلاحیت کار بہتر بنانے کے لئے اپنانا چاہیے۔

ہفتہ وار دو چھٹیوں سے سرکاری اور ملکی انتظامی اخراجات میں معتد بہ بچت بھی ہوگی۔ سال بھر میں ۵۲ جمعے اور دیگر ۱۲ یا ۱۳ قومی اور دینی تہواروں کی چھٹیاں نکال کر کل تین سو ایام میں سے ۵۲ چھٹیاں اور نکالنے سے چھٹا حصہ اخراجات میں بچت ہوگی۔ مثلاً کسی دفتر کے اگر پچاس اہلکاروں میں سے اگر دس ملازمین بھی کسی روز حاضر ہوں تو پورے دفتر میں بجلی، پانی پنکھوں، ہیٹروں وغیرہ کا خرچہ وہی ہوگا جو پچاس افراد کی حاضری کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس طرح سال میں مزید ۵۲ روز ہر سرکاری دفاتر بند رہنے سے چھٹا حصہ بجلی، پانی وغیرہ کے اخراجات میں بچت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ دفتر آنے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ، دفتر کے کپڑے، ان کی دھلائی اور دیگر امور کی انجام دہی کے لئے اٹھنے والے اخراجات میں بھی بچت ہوگی۔

اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ملازمین کو غم روزگار کے علاوہ اپنے انفرادی اور اجتماعی و قومی معاملات کے بارے میں فکر و تدبر کے لئے فرصت کے اوقات میسر آیا کریں گے اور ان کی تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کو جلا ملے گی۔

علم بہتر ہے یا دولت

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ علم بہتر چیز ہے کہ دولت۔ آپؓ نے فرمایا علم دولت سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ دولت قارون و فرعون کو ملتی ہے اور علم پیغمبروں کو ملتا ہے۔ انسان کو دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے مگر علم انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ دولت والے آدمی کے دشمن بہت ہوتے ہیں مگر علم والے آدمی کے دوست۔ دولت خرچ کرنے سے گھٹتی ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ دولت مند بخیل اور علم والا سخی ہوتا ہے۔ دولت کو چور چرا سکتے ہیں علم کو نہیں چرا سکتے۔ دولت غرور سکھاتی ہے اور علم حلم سکھاتا ہے۔

باطل نظریات کے خلاف ہماری جدّ و جہد جاری رہے گی

مرکزی مجلس عمومی کا اجلاس مئی میں ہوگا

طلبہ میں عمل کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے ہر سال جمعیۃ کا کنونشن ہوا کرے گا

مرکزی کنونشن سے قائد طلباء کا خطاب

جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کے زیر اہتمام عظیم الشان مرکزی کنونشن پوری آب و تاب سے منعقد ہوا جس میں کراچی سے لے کر خیبر تک کے طلباء مندوبین نے انتہائی جوش اور ولولے سے شرکت کر کے کنونشن کو ایک مثالی کنونشن بنایا۔ کنونشن کی مختلف نشستوں

مولانا محمد نبی محمدی،
امیر حرکت انقلاب اسلامی

- شیخ طریقت حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی
- حضرت مولانا مفتی محمود
- مولانا محمد اجمل خاں
- استاد عطا محمد سندھو اور
- دیگر علماء کرام کے علاوہ
- قائد طلبہ جاوید ابراہیم پراچہ
- ندیم اقبال اعوان
- نذیر احمد بھنوار
- ظہیر میر
- محمد قاسم شابوی
- محمد سلیمان ابڑو
- محمد اسلم وسیر

اور دیگر طالب علم راہنماؤں نے خطاب کیا۔

ممتاز قومی راہنما اور جہاد کمیٹی پاکستان کے صدر مولانا مفتی محمود نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"طلبہ اپنے اندر جہاد اسلامی کا جذبہ پیدا کریں"۔

مولانا محمد نبی محمدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

"علماء حجروں میں بیٹھنے کی بجائے میدانِ عمل میں آکر قوم کی قیادت کریں۔"

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی نے کہا کہ:

"لا دینیت کا خطرہ عالمگیر سیلاب کی شکل اختیار کر گیا ہے طلبہ ہی اپنے جوان جذبوں اور اعلیٰ صلاحیتوں سے اس کا راستہ روک سکتے ہیں"۔

قائد طلبہ جناب جاوید ابراہیم پراچہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

"باطل نظریات کے خلاف ہماری جد و جہد جاری رہے گی"۔ علاوہ ازیں انہوں نے مرکزی مجلس عمومی اور چاروں صوبائی مجالس عاملہ کے ایک خصوصی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ میں عمل کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے ہر سال جمعیۃ طلبہ اسلام کا ایک مرکزی کنونشن ہوا کرے گا۔ انہوں نے آخر میں اس بات کا اعلان کیا کہ مرکزی مجلس شوریٰ

کا اجلاس منٹمگری میں منعقد ہو گا۔

دو روزہ کنونشن کے اختتام پر منعقدہ جہاد کانفرنس میں مولانا مفتی محمود نے فلسفۂ جہاد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

علاوہ ازیں جہاد کانفرنس سے

- ندیم اقبال اعوان،
- حافظ اطہر عزیز،
- مولانا محمد نبی محمدی اور
- حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی

نے خطاب کیا۔

مبارکباد اور شکریہ

جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کے
مرکزی صدر
قائد طلبہ
جناب جاوید ابراہیم پراچہ، اور
مرکزی ناظم عمومی
جناب ندیم اقبال اعوان
صدر مجلس استقبالیہ
حافظ اطہر عزیز

نے جمعیۃ طلبہ اسلام کے ساتھیوں کو اس عظیم الشان کنونشن کی کامیابی پر مبارک باد دی ہے اور تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا ہے جو کنونشن میں شریک ہوئے۔ اس کی کامیابی کے لئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کیں۔

جمعیۃ طلباء اسلام کے مرکزی راہنماؤں نے تمام علماء کرام اور خصوصاً حضرت مولانا محمد نبی محمدی، مولانا مفتی محمود اور شیخ طریقت حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی اور مولانا محمد اجمل خان، سرپرست جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود کنونشن میں شرکت کر کے سرپرستی فرمائی۔

نجیم خان سے تعزیت

جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان، صوبہ بلوچستان کی کنوینگ باڈی کے اراکین
حافظ حسین احمد
نظام الدین پانیزئی
محمد سلیمان اچڑو
ضمیر اسحق
محمد قاسم شاہوانی و دیگر اراکین جمعیۃ طلبہ اسلام صوبہ سرحد نے ناظم عمومی جناب نجیم خان کے والدِ محترم کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی ہے۔

جمعیۃ طلبہ اسلام ضلع لاہور کے راہنما اور گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز کے طالب علم جناب حافظ عبد اللطیف عثمانی نے جناب نجیم خان کے والد محترم کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور مرحوم کے لئے دعا کی ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

صرف اور صرف
جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان

جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کے مرکزی صدر قائد طلباء جناب جاوید ابراہیم پراچہ نے اپنے ساتھیوں کے نام ایک غلط فہمی کے ازالہ کے طور پر ایک بیان میں کہا کہ:

"میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ جمعیۃ طلبہ اسلام کے چند ساتھی جمعیۃ طلبہ اسلام کے علاوہ مختلف عنوانات سے قائم تنظیموں میں کام کر رہے ہیں، جن میں "اقبال یوتھ کونسل" "سنی سٹوڈنٹ کونسل" وغیرہ کے نام سے تنظیمیں قابل ذکر ہیں۔

میں واضح طور پر اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ "جمعیۃ طلباء اسلام" سے منسلک ساتھیوں کو اس قسم کی کسی تنظیم کے پلیٹ فارم سے کام کرنے کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے۔ جمعیۃ طلباء اسلام کے ساتھی اس قسم کی کسی تنظیم سے کوئی تعاون نہ کریں۔

الحمد للہ جمعیۃ طلباء اسلام ایک نظریاتی تنظیم ہے جو طلباء کی اخلاقی، روحانی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے صرف اور صرف جمعیۃ طلبہ اسلام ہی سے مخلص ہو جائیں۔